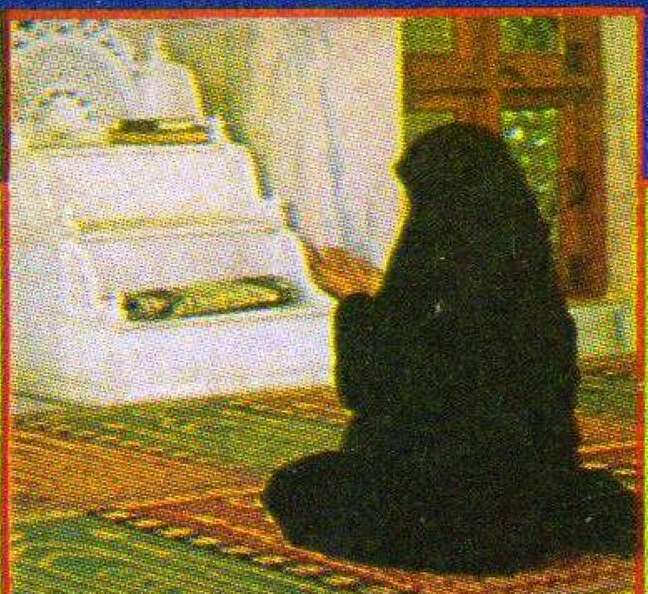
قیمت: پانچ روپے

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی



خصوصی گوشہ

اور اب مسلم خواتین نے اسلامی انقلاب کا پرچم تھام لیا



- کیا اسلام خواتین کو سرگرم سماجی زندگی سے روکتا ہے؟
- ہندو پنڈتوں کے بعد اب بی جے پی کے مسلمان مولوی میدان میں
- بوسنیا میں مسلم انقلابیوں کے جمتے قدم سے مغرب پریشان
- امریکہ میں امیدوارانِ رحمت کے ظہور

AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D.KR. 1400	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRILANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N.Kr 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F.MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM 3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$ 3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	£ 1.30
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	US $ 3.00

کیا آپ کو معلوم ہے

ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا

(اور اللہ اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کفار مسلمانوں پر حکمراں بن جائیں)

النساء

قرآن کے اسی حکم کی اتباع میں

ملی پارلیامنٹ

نے اہل ایمان کی سیاسی صف بندی کا کام زور شور سے شروع کر رکھا ہے۔

بشارت که ایک نئی

ملک گیر مسلم سیاسی پارٹی

کے قیام کا وقت اب قریب آپہنچا ہے۔ ملک بھر میں آپ کے باحوصلہ بھائی بہن موجودہ نظام جبر سے نکلنے کے لئے حرکت میں آچکے ہیں

یاد رکھئے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الكفر ملة واحدة**

کانگریس ہو یا بی جے پی، جنتادل ہو یا سماج وادی، بی ایس پی ہو یا کوئی اور یہ سب کے سب ایک ہی ملت کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے کسی کو سیکولر سمجھنا یا کسی کو مسلمانوں کا ہمدرد بتانا دراصل رسول اللہ کے اس ارشاد کو جھٹلانا ہے۔ خدارا اللہ کے رسول کو جھٹلا کر خدا کے غضب کو دعوت مت دیجئے۔

گھر گھر، قریہ قریہ اس انقلابی پیغام کو لے جانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ اللہ کی مدد کے سہارے آگے آئیے۔ مستقبل آپ کے انتظار میں ہے۔

Milli Parliament

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 25

Phone : (011) 6827018/6926030 Fax : (011) 6946686

برائے کرم اس اشتہار کی فوٹو کاپیاں بنوا کر مختلف مقامات پر چسپاں کیجئے

ملی ٹائمز
انٹرنیشنل
نئی دہلی

اکتوبر ۱۹۹۷ء

قیمت: پانچ روپے

سالانہ زر تعاون: ساٹھ روپے

بیرون ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)

۲۰ امریکی ڈالر

اس شمارے میں

یکے از مطبوعات

مسلم میڈیا ٹرسٹ

ایڈیٹر: محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

فون: ۶۸۲۷۰۱۸ فاکس ۶۹۴۶۶۸۶

اداریہ

باسمہٖ تعالیٰ

وہ جو دانا ہیں، جنہیں صورت حال کی واقفیت کا زعم ہے، دانشوری جن کے چہروں سے عیاں اور روحانیت جن کے حلیے سے ہویدا ہے، وہ سب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ اس ملک میں امام عادل کی غیر موجودگی کی وجہ سے مسلم خواتین پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری ماؤں اور بہنوں پر ایک ایسی دردناک صورت حال طاری ہے جسے اسلامی شریعت ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتی لیکن ہم اپنے مطمئن انداز سے یہ تاثر دینے میں ماہر ہیں گویا حقائق کی دنیا میں ایسی کسی صورتحال کا گزر نہیں یا کم از کم ہم اس صورت حال سے واقف نہیں۔

ہمیں زعم ہے کہ شریعت کے مطالب و مفاہیم ہم پر منکشف ہوچکے ہیں۔ اے کاش کہ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا اور ہم جانتے کہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ ہم آج جن سماجی اقدار اور رسم و رواج کو شریعت سے قریب تر جانتے ہیں ان کا شریعت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت ہمارے خود ساختہ سماجی تصورات اور معاشرتی اقدار کی سخت نفی کرتی ہے لیکن ہم اس بات پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ جب اتنے بہت سے عقلمندوں، بھاری بھر کم اصطلاحوں میں قیل قال کرنے والے علماء و دانشور مسلم خواتین کی موجودہ صورت حال پر مطمئن ہیں تو یقیناً اس میں عقل و دانش کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوگا۔ لیکن اگر شرابیوں، زانیوں اور اخلاق باختہ انسانوں کی کثرت تعداد ان کے عمل کو اعتبار نہیں بخش سکتی تو خود ساختہ شریعت کے بہت سے حواریوں کے پائے جانے سے اسے محض اس لئے کیسے اعتبار حاصل ہوسکتا ہے کہ اس رویے کے ماننے والے بہت زیادہ ہیں۔

ایک ایسے عہد میں جب عورتوں پر مظالم عام ہوں۔ طلاق کا کلچر ہمیں مسلسل اپنی گرفت میں لے رہا ہو۔ نظام کفر کے اندر محض موجودہ پرسنل لاء کے سہارے مسلم خواتین پر ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ نہیں کیا جاسکتا۔ محرومیوں کی ماری مسلم خواتین جس کی زندگی کی وہ تمام مسرت جو اسلام نے اسے عطا کیا اور موجودہ مسلم معاشرے نے اس سے چھین لیا ہے آخر اپنی محرومی کا مقدمہ کس امام عادل یا خلیفہ کے پاس لے جائے۔ انصاف کے لئے وہ جائے تو جائے کہاں؟

اس کا خوف اسے نظام جبر کی عدالت تک لے جاتا ہے اور وہ خوفزدہ اس لئے ہے کہ اس کے قدم نظام جبر کی عدالت کی طرف اٹھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سیاہ دھند میں اس کا دینی وجود کھوتا جارہا ہو۔ اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے جیسے شریعت کا آفتاب مسلسل نصف النہار پر ہو۔ لیکن اس کا جسم صرف اس سورج کی تپش محسوس کرتا ہے جیسے سیاہ دھند نے روشنی پر پہرہ بٹھا دیا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر اسلام کے انقلابی مشن میں مسلم خواتین کو بھرپور شرکت کے مواقع فراہم کئے جائیں تاکہ ہماری آدھی قوت دوبارہ ہمیں واپس مل سکے اور اس ملک میں شریعت مجبوروں کی زبان بندی کے بجائے کمزوروں اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی علامت بن سکے۔

جماعت اسلامی اور ایس آئی ایم

محترمی! تسلیمات

آج کل جماعت اسلامی، ایس آئی او اور ایس آئی ایم میں اخبارات کے صفحات میں مراسلات کے ذریعہ جو معرکہ برپا ہے ان سب مراسلات کو پڑھ کر دل تشکر کے جذبہ سے لبریز ہو گیا کہ مولا یہ تیرا کرم ہے کہ میں جماعتی جھگڑوں سے الگ ہوں۔ میں نے مولانا مودودی کا لٹریچر اس مدرسے میں رہتے ہوئے پڑھا ہے جہاں پر ان تحریروں کا پڑھنا ناقابل معافی جرم ہے۔ میرے دوستوں کے حلقے میں ایس آئی او کے افراد اور ایس آئی ایم کے افراد بھی شامل ہیں۔ میں ہمیشہ ان گروہ بندیوں کا مخالف رہا اور ہوں۔ البتہ اس وقت تک میرا دل روک رہا تھا کہ چاہے جماعت اسلامی ہو، چاہے ایس آئی ایم ہو، چاہے ایس آئی او ہو، یہ سب جھنجھٹ ہیں جن کو پالے بغیر کام انتہائی آسانی سے اللہ کی رضا کے لئے کیا جاسکتا ہے۔ کیا اللہ کے یہاں ان جماعتوں میں شمولیت کے بغیر نیکیاں قبول نہیں ہوں گی؟

جماعت اسلامی سے مجھے اس لئے محبت ہے کہ اس کے اکابرین کی کتابیں اور تفاسیر کا مطالعہ میرا ذوق ہے۔ ایس آئی او مجھے اس لئے پسند ہے کہ اس کے نوجوان منکسر المزاج ہیں۔ ایس آئی ایم سے اس لئے لگاؤ ہے کہ ان کے جذبات و کردار میں گرمی ہے اور ان سب سے مجموعی طور پر اس لئے اختلاف ہے کہ یہ سب اونچی اونچی دیواریں ہیں جن سے صحن اسلامی بنتا ہے اور اب تو ذہن اسلامی بھی بنٹ گیا ہے۔

جماعت اسلامی میں اب بعض بااثر بزرگوں کی وجہ سے چودھراہٹ کا عنصر غالب ہے۔ اسی لئے روز اول سے ۱۹۸۰ء تک کسی بھی طلبہ تنظیم کے سر اٹھانے کے مخالف رہی ہے۔ اور جہاں کہیں بھی طلبہ نے اپنے آپ کو منظم کیا اس کو سرپرستی کے نام پر کچل دیا گیا۔ خیر سے جماعت اسلامی کے ارکان جیلوں میں گئے اسی "انتہائی کربناک حالات" ۱۹۷۵ء میں گمنام طلبہ تنظیم وجود میں آئی اور دو سال تک کام کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ میں ایس آئی ایم کے نام سے ایک نیا نظم بنا جو بن گیا سو بن گیا اب جماعت اسلامی نے سرپرستی کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن جس کو اس نے پیدا نہ کیا ہو بلکہ پیدا ہونے کے سارے امکانات کا ناس کیا ہو اس کی سرپرستی میں طلبہ کیونکر آنے والے۔ ایس آئی ایم سے جماعت اسلامی روز اول سے ہی مایوس رہی۔ اسی لئے اس نے اپنے جذبہ سرپرستی کی تسکین کے لئے باقاعدہ ایک الگ سے طلبہ تنظیم بنائی جس کو شروع میں I.T.T کے نام سے جانا گیا اور بعد میں اس کو ایس آئی او کے نام سے جانا گیا۔ ظاہر ہے جو بوڑھے سرپرستی کے خواہاں تھے انہیں جیسے ہی کچھ نوجوان ہاتھ آئے، سرپرستی کی انتہا کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایس آئی او کے نوجوانوں میں بددلی پھیل گئی اور وہ آہستہ آہستہ جماعت سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جماعت کو اپنے دو سالہ میقاتی پروگرام میں یہ بات طے کرنی پڑی (جو ان کے چھپے ہوئے دو سالہ میقاتی پروگرام میں موجود ہے کہ ایس آئی او کے لوگوں کو جماعت میں لانے کی شعوری کوشش کی جائے گی آپ خود سوچیں کہ اس کا کیا مطلب ہے، باپ خود طے کرے کہ اپنے بیٹے کو دوبارہ اپنے گھر لانے کی کوشش کریں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ بیٹا روٹھ کر بہت دور چلا گیا ہے۔

یہ تاثر عام کیا جارہا ہے کہ ایس آئی او کے لوگ جوق در جوق جماعت میں آرہے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ملاحظہ فرمائیں، مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا بیان "میرے نزدیک جو بات زیادہ توجہ کی طالب ہے وہ یہ مسئلہ ہے کہ ایس آئی او اور جی آئی او کے جو لوگ عمر کی مقررہ حد پر پہنچنے کے بعد نکلتے ہیں ان میں سے صرف تیس فیصد افراد جماعت میں شامل ہوتے ہیں۔ باقی ۷۰ فیصد افراد بے عملی اور تعطل کا شکار ہو جاتے ہیں یا ملت میں گم ہو کر اپنا تشخص کھو دیتے ہیں۔"

سچ ہے کہ جماعت اور ایس آئی او میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے نتیجہ ہیں ۷۰ تا ۸۰ فیصد ایس آئی او کے نوجوان جماعت اسلامی کی سرپرستی میں جوانی کا خاص حصہ گزار کر پھر اس سے دور ہو جاتے ہیں یہ بات صاف اور واضح ہے کہ جماعت اسلامی میں اور ایس آئی او میں اب سیدھا سیدھا ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے۔

جماعت اسلامی کا محبوب رسالہ زندگی نو اگست ۱۹۹۷ء نے تو بزرگوں اور نوجوانوں کے اختلاف کو سڑکوں پر ڈال دیا ہے۔ بعض نوجوان کہتے ہیں کہ جذبہ سرفروشی دین کی اصل ہے یہ اس کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی جس کا دل سرفروشی کی تمنا سے خالی ہو وہ منافق ہے، بزدل ہے اور مصلحت کوش ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے باپ نے جس نے مسلسل سترہ سالوں سے اپنے نوجوانوں کی آبیاری کی ہو۔ ان کو بکھرتا ٹوٹتا بھاگتا دیکھ کر اسی طرح کی باتیں کر سکتا ہے۔ اس مضمون سے بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ شاید یہ مضمون ایس آئی ایم کے نوجوانوں کو ہدف بناتا ہے حالانکہ دراصل اس کا رخ ایس آئی او کی طرف ہے۔ ایس آئی ایم اور جماعت اسلامی دونوں الگ الگ ہیں اور روز اول سے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان گزشتہ سالوں سے پابندی عمیل رہے ہیں کہ وہ ایس آئی ایم کے پروگرام درس قرآن، درس حدیث اور تذکیر تک نہیں کر سکتے اور ایسا کرنے پر ان کا اخراج ہو جائے گا۔ (مولانا عبداللطیف صاحب کے ساتھ یہی ہوا) جماعت اسلامی کو ایس آئی ایم سے متعلق کوئی بات کہنا ہوتی ہے تو وہ صاف صاف کہتی ہے جیسے تحریک اسلامی کی صفوں میں گھس آنے والی کالی بھیڑ کہا۔ (ایس آئی ایم کے ذریعہ چلائی جانے والی مہم نیشنلزم یا خلافت، ملت بیداری مہم کو نائب امیر جماعت نے ایک فتنہ کہا۔ اتنے بے باک لوگ ایس آئی ایم کے لئے اس قدر کنایہ و اشارہ کا سہارا کیوں لیں گے؟ صاف صاف معاملہ باپ اور بیٹے کا ہے اب اس کے بعد بھی کوئی نہ سمجھے تو کیا کہا جائے؟ جس ایس آئی ایم سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو گزرے ہوئے سات سالوں میں بالکل کوئی تعاون و تعلق نہ ہو ان پر نزلہ گرنے کا کیا سوال ہے؟ کوئی جواز؟ کہیں باسی کڑھی میں ابال آتا ہے۔

سکندر علی قاسمی۔ مدرس اسلامک نرسری اسکول، اپر کورٹ علی گڑھ

احتساب نمبر

ملی ٹائمز کا ایک ایک شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ بالخصوص اگست کا شمارہ احتساب نمبر ایک یادگار شمارہ ہے جس میں آپ نے جہاں پچاس سالہ بوڑھی آزادی پر حق و بےباکی کے ساتھ اداریہ لکھا ہے وہیں آزادی کے پچاس سالوں میں ملی مسائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ جو انتہائی عرق ریزی اور آپ کی زبردست کاوشوں کا نتیجہ ہے

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

تصاویر غیرت کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کی بے حسی بے غیرتی اور خوشامد خوری چاپلوسی جی حضوری پر بھرپور طمانچہ مارا ہے۔ تصاویر دیکھ کر اقبال کا شعر یاد آگیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ضیاء مجاہد، گلبرگہ شریف، کرناٹک

۲

اگست ۱۹۹۷ء کا احتساب نمبر پڑھ کر بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ آپ نے مسلمانان ہند کو ان کے حقوق کیا ہیں انہیں ملک میں کس طرح رہنا چاہئے نیز ایسے علماء جو اپنی سیاسی دوکانیں چمکانے کے واسطے "تصاویر غیرت یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود" شائع کیا اس امر پر واقعی غیرت کا مقام ہے۔ آخر یہ لوگ سب کچھ جانتے ہوئے بھی نااہلی کا ثبوت کیوں دیتے ہیں۔ حب الوطنی ایک الگ چیز ہے مگر یہ کیا کہ دستار بندی جس کی فضیلت بلند والا ہے اس کو حب الوطنی یکجہتی میں شامل کرلیا جائے کیا شریعت مطہرہ اس بات کی اجازت دیتی ہے۔ نماز میں سورہ الفاتحہ میں کہتے ہیں "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں" پھر بھی علماء کا وفد اس عزم مصمم کے ساتھ کہ "تیرے در سے نہ جائیں گے خالی۔

آج کے ماحول میں لوگ علماء کرام پر طنز کرتے ہیں اس کی حقیقت صرف یہی ہے کہ مفاد پرستی میں بہت سے علماء اس بات کو دھیان میں نہیں رکھتے کہ ہم نائب رسول ہیں ہمارے فعل سے معاشرے پر برا اثر پڑے گا کیا ایڈیٹر صاحب ایسے علماء کے واسطے کچھ ہدایت کرنے کے واسطے کچھ شائع کریں گے۔

حافظ عبدالرحمن، نواب پورہ، مراد آباد (یوپی)

۳

مکرمی! السلام علیکم

گزارش احوال یہ ہے کہ آپ کی تنظیم سے اور پرخلوص کوشش کے جذبات سے میں اور میرے دوسرے بہت سے دوست حضرات بہت متاثر ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کی کھوئی ہوئی قوتیں ایک بار پھر یکجا ہوجائیں اور ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ یک جٹ ہوجائے۔

ہم لوگ آپ کی ساری جدوجہد اور کوشش کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے ایک حقیر سی رائے دینے کی جسارت کریں گے کہ اگر ہمیں اپنا کھویا ہوا ماضی دوبارہ حاصل کرنا ہے تو سب سے پہلے نئی نسل کو درست کرنا پڑے گا۔ میری مراد چھوٹے بچوں سے ہے جن کو ہم تعلیم کے لئے آر ایس ایس کے اداروں میں بھیج رہے ہیں جہاں وہ ہاتھ جوڑ کر تعلیم کی دیوی یعنی سرسوتی کی پوجا تک کرتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کا سدباب کرنا ہوگا۔

اس کے لئے اگر ملی پارلیمنٹ کے زیر نگرانی اسکولوں اور اداروں کا قیام کیا جائے جہاں پر ہمارے نونہالوں کو ہر قسم کی یعنی دینی دنیاوی اور فنی یا عسکری تعلیم کا بندوبست ہو اگر اس پر ہم لوگ غور کریں اور میری اس بات سے آپ متفق ہوں تو میرے خیال سے آنے والے سالوں میں انشاء اللہ آج بھی ہم طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے نوجوان پیدا کرسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ہم اس جانب پوری توجہ فرمائیں۔

عبدالخالد خاں۔ مرزا پور، پوسٹ ممتاز نگر، ضلع فیض آباد (یوپی)

۴

مکرمی! السلام علیکم

"ملی ٹائمز" کا اسپیشل شمارہ نظروں سے گزرا واقعی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ آپ نے اس شمارے کو احتساب کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ امید قوی ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی آپ قرآن وسنت کی روشنی میں امت مسلمہ کے مسائل کا حل بھی پیش کریں گے۔

فی الوقت اس شہر میں کچھ نوجوان اقامت دین اور مسائل ملی کو امکانی حد تک دور کرنے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کوشاں ہیں لیکن رہنمائی کا فقدان محسوس کرتے ہیں۔ لہذا آپ سے مخلصانہ طور پر عرض ہے کہ ازراہ کرم یہ بتانے کی زحمت گوارہ کریں اس سلسلے میں آپ کس حد تک اور کس نہج پر ہم لوگوں کی رہنمائی اور تعاون کرپائیں گے۔

شعیب، محمد عزیز خاں، محمد پرویز احمد، محمد سیف (ہزاری باغ)

عملی جدوجہد کی ضرورت

ملی ٹائمز کا میں ہر مضمون بہت غور سے پڑھتا ہوں اور خاص کر وہ خطوط جو دوسرے ورق پر شائع ہوتے ہیں ان خطوط کو پڑھنے سے یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ امت مسلمہ خلافت ختم ہوجانے سے اس آزاد ملک میں اپنے آپ کو کس قدر بے بس محسوس کر رہی ہے۔ آخر کیوں نہ ہو؟ جہاں پر کبھی اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں وہاں پر آج وندے ماترم جیسی غلیظ آوازیں گونج رہی ہیں۔ جہاں پر کبھی لا الہ الا اللہ کا پرچم لہراتا تھا آج وہاں رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے ہیں اور جہاں پر کبھی برے کام کرنے والے کو سزا دی جاتی تھی آج وہاں ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے والے کو باعزت بری کردیا جاتا ہے۔ آج جب ملی پارلیمنٹ نے پھر سے خلافت قائم کرنے کے لئے سیاست میں آنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم تمام کلمہ گو بھائی بہنوں کا کیا فرض بنتا ہے؟ کیا ہم صرف کاغذ پر دلی مبارکباد بھیج کر اپنا فرض پورا کرسکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر وقت ضائع کئے بغیر اس جدوجہد میں شریک ہوجانا چاہئے۔ یہ تو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی کوئی بھی سیاسی پارٹی مخلص نہیں ہے اور اس سچ سے بھی ہم انکار نہیں کرسکتے کہ مشرک کبھی مسلمانوں کا دوست یا رہبر نہیں ہوسکتا ہے۔ خلافت پھر سے قائم کرنا جتنا ملی پارلیمنٹ کے افراد کا فرض ہے اتنا ہی دنیا کے باقی تمام مسلم بھائی بہنوں کا بھی فرض ہے۔

فہد، رشید کالونی، سیوان (بہار)

سود کے خلاف بھی کچھ کیجئے

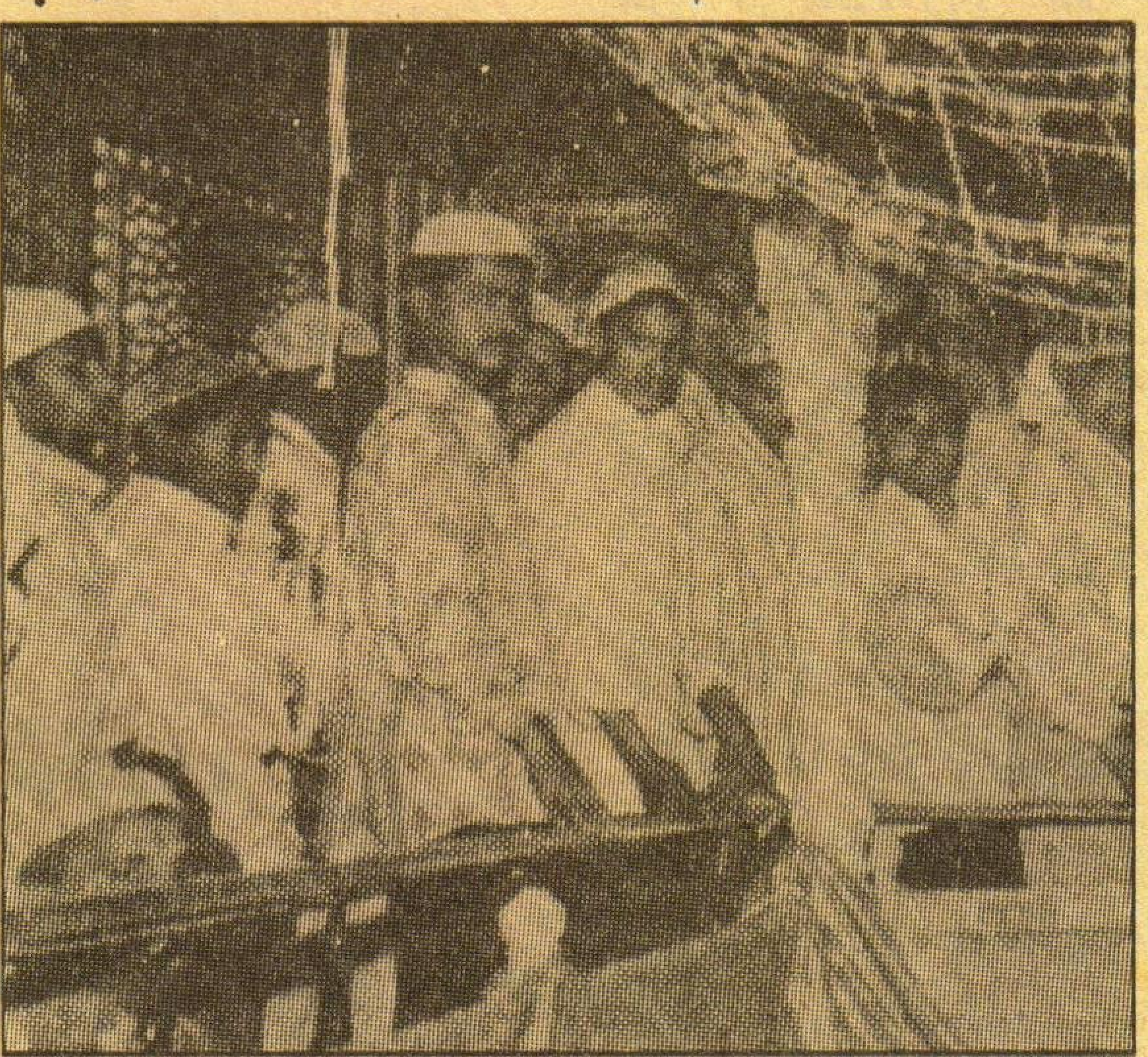
جناب عالی! آپ کو مسرت ہو رہی ہے کہ مودودی صاحب کی ایک غلطی آپ نے دکھا ہی دی اسلئے آپ بڑے عقلمند نکلے۔ دارالحرب کے متعلق نہ جانے کہاں سے آپ نے کچھ پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ مودودی صاحب کی کتاب سود کو پڑھتے تو شاید اس طرح نہ لکھتے مناظر احسن گیلانی کا مولانا نے جس طرح جواب تفصیل سے دیا ہے وہ اتنا مہتم بالشان ہے کہ دل کی ساری گرہیں کھل گئیں اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ مولانا نے جس صورت حال کے تحت شادی بیاہ اور وراثت کی تقسیم مابین مسلمانان ہند و پاک کے دئے وہ بالکل بجا ہے رسائل وسائل پڑھئے۔ انہوں نے تو صاف صاف الفاظ میں سود خوری کی مذمت کی ہے لیکن آپ سے ہم کو یہ شکایت ہے کہ نہ جانے کیوں سود کی مذمت میں آپ کا قلم اب تک خاموش ہے۔

محمد عظیم اللہ، نظام پور، گورکھپور

قصہ بھاجپائی مولویوں کے میدان میں آنے کا

اگر بی جے پی کے مولوی قابل قبول نہیں ہوسکتے تو کانگریسی اور جنتادلی مولویوں پر اعتبار کیوں؟

اتر پردیش کے مختلف شہروں سے کوئی دو سو علمائے کرام لکھنؤ میں اس لئے جمع ہوئے تھے کہ وہ بی جے پی کو مسلمانوں کا ہمدرد باور کراسکیں۔ ان کی ٹوپیاں اونچی، داڑھیاں لہراتی، بل کھاتی، جسم پر فربہی اور بے فکری کا انداز اور جبہ و دستار کا وہی مخصوص یونیفارم جو اس پیشے کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان میں سے بیشتر مختلف خانقاہوں کے سجادہ نشیں اور مدارس کے مہتمم تھے انہوں نے اپنے اردگرد تقدس کی تنابیں کھینچ رکھی تھیں۔ شرعی اصطلاحوں اور فقہی موشگافیوں سے وہ یہ تاثر بھی دیتے تھے کہ وہ کوئی اور نہیں انبیائے کرام کے مشن کے وارث ہیں اور ان کا شمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین میں ہوتا ہے۔



لیکن بظاہر مذہبی نظر آنے والے ان لوگوں نے جب اسٹیج پر خطابت کے جوہر دکھایا تو اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی طرف منسوب کی جاتی۔ انہوں نے بڑے فخر سے یہ اعلان کیا کہ وہ بی جے پی کے رکن ہیں جو بقول ان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا مخلصانہ پروگرام رکھتی ہے۔

بی جے پی کے اس کنونشن میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا مختلف مسلم دانشگاہوں سے مسلمانوں کی شرکت ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طلباء کی ایک مختصر سی تعداد بھی موجود تھی۔ ان سبھوں نے اس کنونشن سے مسلمانوں کو ایک ہی پیغام دیا وہ یہ کہ مسلمان کسی اور سیاسی پارٹی کے جھانسے میں نہ آئیں بلکہ بی جے پی کو اپنا غمگسار تسلیم کرلیں۔ لکھنؤ کے اس پروگرام کی کامیابی کے بعد اب بی جے پی ملک کے مختلف علاقوں میں اسی نوعیت کے کنونشن منعقد کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے جس میں طالع آزما مسلمانوں اور قابل خرید مولویوں کو یہ ذمہ داری سونپی جائے گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو بی جے پی کی خدمت کے لئے تیار کریں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ دنوں سورن جینتی رتھ یاترا کے موقع پر ایڈوانی جی نے مسلمانوں کو تعلیم اور روزگار کے مسائل پر توجہ دینے کا مشورہ دیا تھا اور یہ بات بھی کہی تھی کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا کام بی جے پی دوسری سیاسی پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ جو لوگ فلاح و بہبود کے صحیح مفہوم سے آشنا ہیں انہیں ایڈوانی جی کے اس قول کی صداقت پر شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ کانگریس فلاح و بہبود کی جن اسکیموں کے تحت مسلمانوں پر مسلسل اذیت ناک عذاب مسلط کئے رکھتی تھی یقیناً بی جے پی کے پاس اس سے کہیں بہتر نسخہ موجود ہے۔ بی جے پی صرف اتنا ہی تو چاہتی ہے کہ مسلمان اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کا خواب ترک کردیں اور یہ بھول جائیں کہ وہ اس ملک کے حقیقی وارث ہیں اور یہ کہ مسلمان کی حیثیت سے اس ملک کو قیادت دینا ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس بات پر آمادہ ہوگئے اور انہوں نے ہندوؤں کی ثقافتی برتری کو قبول کرلیا تو بی جے پی کے یہاں دلت ہندوؤں کی طرح "محمدی ہندوؤں" کے لئے بھی جگہ موجود ہے۔ بی جے پی کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان کانگریس کے ساتھ اپنی وابستگی پر فخر کرسکتے ہیں تو بی جے پی میں ایسی کیا برائی ہے کہ اس سے دامن بچایا جائے۔ مقصد تو دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کے ابھرنے کے ہر امکان پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی جائے۔ پھر آخر بی جے پی اور غیر بی جے پی سیاسی پارٹیوں میں فرق کیوں کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ کنونشن میں دو سو چھوٹے بڑے مولویوں کی شرکت نے غیر بی جے پی مولویوں کے خیموں میں کھلبلی مچادی ہے۔ مختلف سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے مولویوں کو دوبارہ متحرک ہوجانے کا مشورہ دیا ہے۔ دوسری طرف کانگریسی، جنتا دلی اور سماجوادی حلقہ کے مولویوں کو بھی اس بات پر سخت تشویش ہے کہ اگر بی جے پی کے ان نئے مولویوں کو اعتبار حاصل ہوگیا تو ان کی سیاسی اہمیت کا کیا ہوگا؟ دبے دبے الفاظ میں کانگریسی علماء کی طرف سے بی جے پی کے مولویوں کی

مذمت میں چند جملے بھی کہے گئے ہیں اور یہ احساس دلانے کی کوشش بھی کی گئی ہے گویا ان مولویوں نے بی جے پی کی حمایت کرکے امت کے تئیں کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ البتہ کانگریسی اور جنتا دلی علماء خود کو اس پوزیشن میں محسوس نہیں کرتے کہ وہ علی الاعلان پرزور طریقے سے شرعی بنیادوں پر بی جے پی کے علماء کی مذمت کرسکیں۔ اس لئے کہ وہ یہی کام کانگریس اور جنتا دل کے لئے برسہا برس سے کرتے رہے ہیں۔ اگر لکھنؤ میں جمع ہونے والے علماء آج امت کو بی جے پی کی سیاسی محکومی میں دینے کی مہم چلا رہے ہیں تو کانگریسی اور جنتا دلی مولویوں نے بھی تو مسلمانوں کو اپنی اپنی پارٹیوں کے سیاسی محکومی میں دے رکھا ہے۔ شرعی اعتبار سے دونوں صورت حال یکساں ناقابل قبول ہے شریعت کا حکم بی جے پی کے مولویوں کے لئے الگ اور کانگریسی مولویوں کے لئے الگ نہیں ہوسکتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کفر اور اہل کفر ایک امت ہیں"۔ ان کے نام کانگریس ہو یا بی جے پی، جنتا دل ہو یا سماجوادی پارٹی یہ دراصل ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

دریں اثناء میرٹھ میں گاندھی کے سچے پیروکار مولویوں نے بھی ایک جلسہ منعقد کیا ہے اور اس اسٹیج سے کانگریسی اور متحدہ محاذ کے رہنماؤں نے مسلمانوں کی حمایت میں تقریریں کی ہیں۔ علمائے کرام کے اس جلسے سے جس کا اہتمام حضرت مولانا اسعد مدنی کی۔ جمعیۃ العلماء نے کیا تھا یہ پیغام نشر کیا گیا ہے کہ مسلمان ان سیکولر قوتوں کی حمایت میں آگے آئیں جو مسلمانوں کی حمایت اور بی

بی جے پی صرف اتنا ہی تو چاہتی ہے کہ مسلمان اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کا خواب ترک کردیں اور یہ بھول جائیں کہ وہ اس ملک کے حقیقی وارث ہیں

جے پی کے مقابلے کا حوصلہ رکھتی ہوں اور چونکہ ملائم سنگھ نے اس جلسے میں مسلمانوں کی حمایت میں خطابت کے جوہر دکھائے ہیں۔ پاسوان صاحب اس جلسے میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں اور راجیش پائلٹ صاحب کا تعلق اس کانگریس سے ہے جس کے حضرت مولانا پرانے نمک خوار ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو بی جے پی کی محکومیت میں دینے کے بجائے غیر بی جے پی پارٹیوں کے نظام جبر میں رہنے دیں۔ اسی جلسے میں مسلمانوں کی ہمدردی میں اظہار خیال کرتے ہوئے ملائم سنگھ یادو نے کہا کہ حکومت ٹاڈا میں قید معصوم مسلمانوں کی رہائی کا کچھ سامان نہیں کرتی انہیں خود اپنی حکومت سے شکایت ہے۔ کوئی پوچھے کہ آپ اپنے اثرات کو یوپی میں صدر راج کے لئے استعمال کرسکتے ہیں تو ایک چھوٹے سے مسئلے پر ایسی کیا بے چارگی ہے کہ آپ حکومت کو مجبور نہیں کرسکتے۔ ایک ایسی حکومت میں جس میں آپ کی اہمیت مسلم ہے اور جس میں وزارت دفاع جیسا اہم قلمدان آپ کے ہاتھ میں ہے۔



میرٹھ کے جشن آزادی میں مجبور و بے بس مسلمانوں نے تحریک آزادی کے ان مسلم رہنماؤں کو خوب خوب خراج عقیدت پیش کیا جن کی کوتاہ بین سیاست کے نتیجے میں آج یہ امت گزشتہ پچاس برسوں سے سیاسی محکومی کی زندگی گزار رہی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان غلاموں کو اپنی سیاسی غلامی کا احساس بھی نہیں۔ ابھی گزشتہ دنوں آر ایس ایس کے سربراہ راجندر سنگھ نے رام جنم بھومی تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے کے غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا مقصد اہل ملک کو ہزار سالہ غلامی کے اثرات سے نجات دلانا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے وقت مسز گاندھی نے بھی یہ بات کہی تھی کہ انہوں نے ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے۔ جب ہندو رہنما مسلم دور حکمرانی کو اہل غلامی سے تعبیر کریں تو اسے معمول کی گفتگو سمجھا جائے۔ اور اگر مسلمان پچاس سالہ سیاسی بے بسی پر اظہار خیال کریں تو خود ان کے اندر سے

اگر لکھنؤ میں جمع ہونے والے علماء آج امت کو بی جے پی کی سیاسی محکومی میں دینے کی مہم چلا رہے ہیں تو کانگریسی اور جنتا دلی مولویوں نے بھی تو مسلمانوں کو اپنی اپنی پارٹیوں کے سیاسی محکومی میں دے رکھا ہے۔

جبہ و دستار والے مولوی انہیں آزاد ملک کا آزاد شہری باور کرانے کے لئے جشن آزادی کے جلسے منعقد کریں۔ اس مخدوش آزادی کو اعتبار بخشنے کے لئے آزادی کا کارواں نکالیں۔

بی جے پی کے مسلم کنونشن سے اور کچھ ہوا نہیں اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ نظام کفر کے تابعدار اور وفادار مولویوں میں آپس میں خانہ جنگی کا سا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ روایتی طور پر جو لوگ امت کی سیاسی غلامی کا ٹھیکہ لیا کرتے تھے ان کے لئے آنے والے دنوں میں اس کام میں شاید اتنی آسانی نہ ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو وہ نئی مسلم فکر ہے جو ہر قسم کے کفار و مشرکین کے سیاسی تابعداری کو یکسر مسترد کرتی ہے اور جس کا اظہار ملی پارلیمنٹ کی سیاسی قراردادوں اور اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ روایتی کانگریسی مولویوں کے اعتبار ختم ہوجانے سے دوسرے اور تیسرے درجے کے دنیادار علماء کو بھی سیاسی میدان میں قسمت آزمائی کا موقع ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیادار مولویوں کا ٹولہ اب صرف کانگریس کے پاس ہی نہیں بلکہ متحدہ محاذ اور بی جے پی کے پاس بھی موجود ہے۔ ▭

کیا شہزادی ڈائنا مرتے وقت مسلمان تھی؟

کہا جاتا ہے کہ شہزادہ چارلس سے علیحدگی کے بعد ڈائنا اسلام میں خصوصی دلچسپی لینے لگی تھی۔ مسلمان اور مسلم معاشرہ اسے اپنی جانب کھینچتے تھے۔

لیکن کیا انتقال سے پہلے وہ مسلمان ہو چکی تھی؟
وہ پاکستان کیوں گئی؟ حسنات خاں میں اس کی دلچسپی کا سبب کیا تھا؟
ڈوڈی الفائز میں اس کی گہری دلچسپی کا سبب کیا تھا؟
کیا ڈائنا اسلام کی طرف اپنے سفر میں کامیاب ہو گئی تھی؟

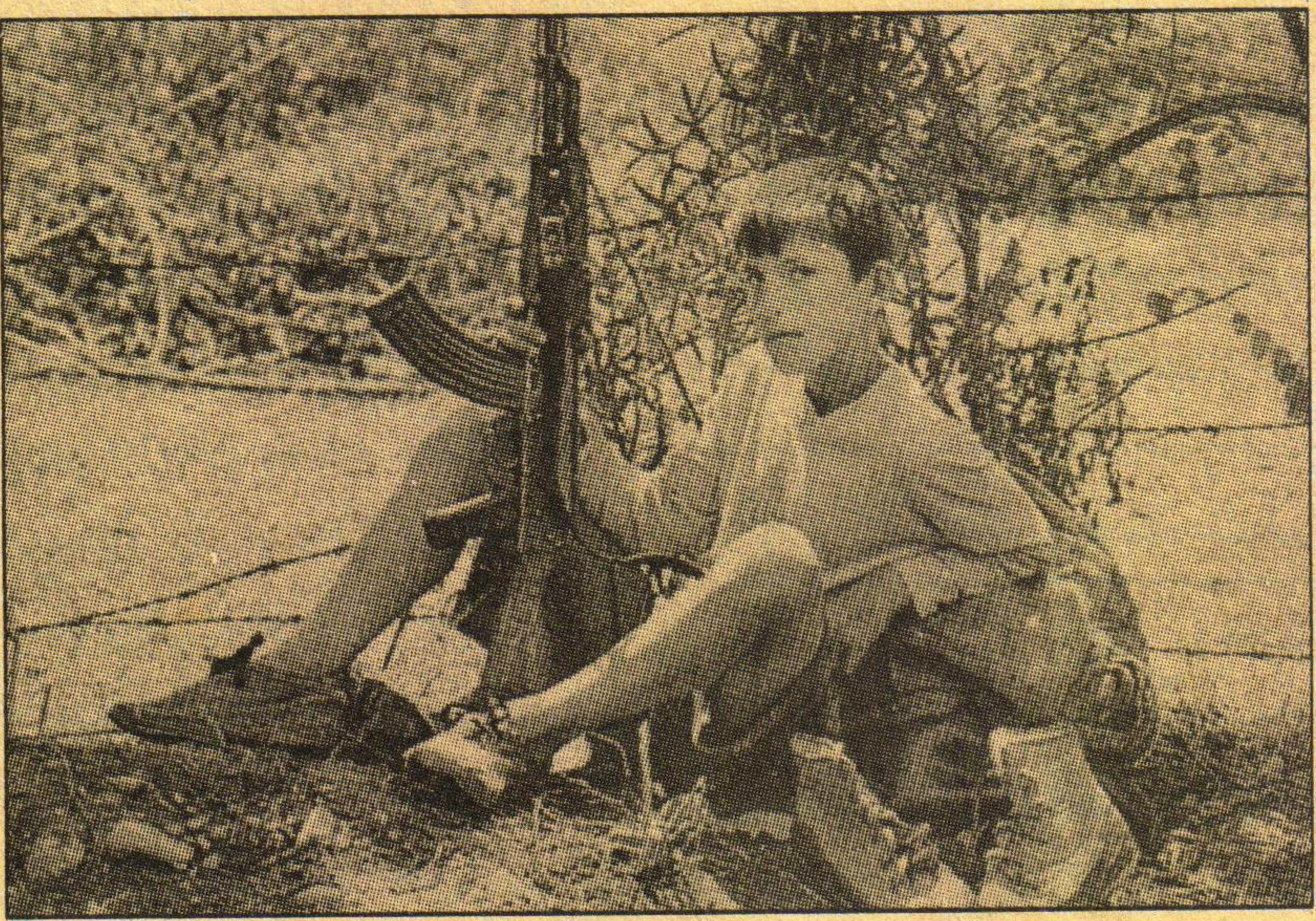
ان سوالوں کے جواب پر مشتمل بہت جلد ملی ٹائمز ایک خصوصی مضمون شائع کر رہا ہے۔

اپنا شمارہ آج ہی محفوظ کرائیے۔

بوسنیا میں انقلابیوں کے جمتے قدم سے مغرب حواس باختہ

دارالحکومت سرائیوو سے تازہ ترین صورتحال پر نمائندہ ملی ٹائمز کی رپورٹ

دو سال پہلے جب یورپ کی اکلوتی مسلم ریاست بوسنیا کا چراغ گل ہونے کو تھا، دنیا بھر سے مسلم نوجوانوں کے دستے بوسنیا پہنچنے لگے تھے۔ مغرب جس کا خیال تھا کہ بوسنیا کی مسلم ریاست کو صفحہ ہستی سے ختم کردینا کچھ مشکل نہیں ہوتا وہ اچانک اس نئی صورت حال سے پریشان ہو اٹھا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یورپ کے عین قلب میں ایک چھوٹی سی مسلم ریاست کی حفاظت کے لئے دنیا بھر سے مسلم انقلابیوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ لہذا بوسنیا کی چارسالہ جنگ میں ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب اہم نوعیت کے شہر زیپا اور سربنیکا مسلمانوں کے قبضے سے نکلتے چلے گئے۔ صورت حال انتہائی سنگین ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سرزمین پر اب کوئی قوت بوسنیا کے وجود کو بچانہ سکے گی لیکن تب عین اسی لمحے اللہ تعالی نے چند باحوصلہ لوگوں کو یہ توفیق دی کہ وہ اس خونریز جنگ کا پانسہ پلٹ دیں۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، مصر، سعودی عرب، جنوبی افریقہ کے ممالک اور یورپ میں آباد مسلمانوں کی نئی نسل نے یہ فیصلہ کرلیا کہ بوسنیا کی صورت حال کو بدل ڈالنے کے لئے راست اقدامی عمل کے آغاز کا وقت اب آچکا ہے لہذا دنیا کے مختلف خطوں میں بوسنیائی مجاہدین اور مہاجرین کی مدد کے لئے اپیلیں کی گئیں۔ آنا فانا یورپ کے مختلف شہروں میں بوسنیائی امداد کے کیمپ اگ آئے۔ ہندوستان میں ملی پارلیمنٹ نے مسلمانوں سے شرکت کی پرزور اپیل کی اور بوسنیا کے بے بس مسلمانوں کی مدد کے لئے عام ہندوستانی شہریوں کو بھی آگے آنے کا مشورہ دیا۔ عالمی سطح پر نفیر عام بلند کرنے والوں کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ بوسنیا کے مسئلے کو محض مسلم حکومتوں کی ذمہ داری سمجھ کر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ملی پارلیمنٹ نے اپنے نشریے میں کہا تھا کہ اگر بوسنیا میں مسلم ریاست کا وجود ختم ہوگیا تو نہ صرف یہ کہ مغرب میں اسلام کی احیاء کے تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ دنیا بھر میں عالمی خلافت کے قیام کے لئے کام کرنے والوں کو بھی اس سے سخت مایوسی ہوگی۔



گوکہ اس وقت ملک میں ملی پارلیمنٹ کی اس تحریک کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن اس کے باحوصلہ اعلانات نے دنیا کے مختلف حصے میں نہ جانے کتنے دلوں میں بوسنیائی مسلمانوں کے لئے کچھ کرگزرنے کا حوصلہ پیدا کردیا۔ نوجوانوں کے دستے مختلف خطوں سے کچھ اس شان سے پہنچے کہ مغرب کے لئے اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوا۔ جو لوگ بوسنیا میں تین لاکھ مسلمانوں کا خون بہانے کے بعد یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ چند بچے کھچے حوصلہ مند

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سرزمین پر اب کوئی قوت بوسنیا کے وجود کو بچانہ سکے گی لیکن تب عین اسی لمحے اللہ تعالی نے چند باحوصلہ لوگوں کو یہ توفیق دی کہ وہ اس خونریز جنگ کا پانسہ پلٹ دیں۔

نوجوانوں کو ٹھکانہ لگانا اب چند لمحے کی بات ہے انہیں اچانک یہ لگنے لگا کہ اگر کسی طرح دنیا بھر سے مسلم انقلابیوں کے قافلوں کی آمد کا سلسلہ زور پکڑ گیا تو بوسنیا کا فوجی آپریشن مغرب کے لئے ایک ناسور بن جائے گا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں عوامی سطح پر مسلمانوں کی شرکت نے بوسنیائی مسلمانوں کو نیا حوصلہ دیا۔

ملی پارلیمنٹ نے اپنے نشریے میں کہا تھا کہ اگر بوسنیا میں مسلم ریاست کا وجود ختم ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ مغرب میں اسلام کی احیاء کی تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ دنیا بھر میں عالمی خلافت کے قیام کے لئے کام کرنے والوں کو بھی اس سے سخت مایوسی ہوگی۔

دیکھتے اکھڑتے قدم جم گئے۔ مسلم فوج کھوئے ہوئے علاقے دوبارہ قبضہ کرنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ جب بنجالوکا کا اہم علاقہ ان کے قبضہ میں آنے کو تھا تب عین اسی لمحے امریکہ اور ناٹو نے مداخلت کے ذریعے جنگ بند کروادی۔ مذاکرات کی میز سجائی گئی اور فریقین کو امن معاہدے پر متفق کرنے کی کوشش کی گئی۔

بوسنیائی مسلمان خوب جانتے تھے کہ امن اس وقت ہماری نہیں بلکہ دشمنوں کی ضرورت ہے وہ چار سال تک جب تک ہم میدان جنگ میں شکست کھاتے رہے کسی امن معاہدے پر تیار نہ ہوئے اور نہ ہی مغربی ملکوں کو بوسنیائی مسلمانوں کے مسئلے سے کوئی دلچسپی پیدا ہوئی لیکن اچانک جب جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمان اقدامی پوزیشن میں آگئے تو امریکہ سمیت مغربی ممالک بوسنیائی مسلمانوں کی حالت زار پر آنسو بہانے لگے۔ بالآخر بوسنیا میں ایک مسلم ریاست کے وجود کو انتہائی بددلی سے تسلیم کرلیا گیا۔ ناٹو کی افواج کو امن معاہدے کی حفاظت کے لئے بوسنیا میں تعینات کر دیا گیا۔

عام طور پر مغرب کے ذرائع ابلاغ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گویا ناٹو کی فوج مسلمانوں کی حفاظت کے لئے تعینات ہو حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آئندہ سال جون میں ناٹو کی افواج کی واپسی کا وقت ختم ہو جائے گا۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ بوسنیا کا تمام گم شدہ علاقہ انہی واپس مل جائے۔ انہیں اس بات کا بھی قلق ہے کہ سرب رہنما کے جنگی جرائم کے لئے انہیں اب تک سزا نہیں ملی ہے۔ بڑے بڑے جنگی مجرم آزاد پھر رہے ہیں۔ عام مسلمانوں میں یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ امن کے پردے میں دراصل مجرموں کو پناہ دینا مقصود ہے اور یہ بھی کہ اس امن سے بوسنیائی مسلمانوں کے بڑھتے قدم روک دئے گئے ہیں۔ دو سال کے بعد اب بوسنیائی مسلمان پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ ان کے اندر اسلامی بنیادوں پر زندگی کو منظم کرنے کا تصور اس دوران پہلے سے کہیں زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ مسلم دنیا سے رابطے اور بوسنیا میں مسلم انقلابیوں کی مسلسل آمد و رفت نے بھی ان کے حوصلوں میں اضافہ کیا ہے۔ مغرب یہ سمجھتا تھا کہ شاید فتح کے مرحلے میں جنگ بندی کے ذریعے وہ بوسنیائی مسلمانوں کے قدم روک دے گا۔ اسے اس کا اندازہ تھا کہ مغرب کی طرف سے دی جانے والی امداد بوسنیائی مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو تھپک تھپک کر سلا دے گی۔ ایک پر آسائش اور آسان زندگی کا تصور انہیں انقلابی عزائم سے رفتہ رفتہ دور لے جائے گا اور ان کے اندر سیکولر، خالی الدماغ اور چاکلیٹ مسلمانوں کی ایک نسل اگ آئے گی۔ لیکن دو سال کے عرصے میں ایسا کچھ بھی ممکن نہ ہوا۔ چاکلیٹ مسلمانوں کو اپنے خیالات کی آبیاری میں سخت ناکامی ہوئی۔ دوسری طرف سربوں کے خیمے میں بے چینی میں اضافہ ہوا۔ شکست خوردہ فوج آپس میں الجھنے لگی۔ مسلم دشمنی کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور جذبہ نہ تھا جو انہیں باندھے رکھتا لہذا جب جنگ ختم ہو گئی تو عظیم سربیہ کا خواب بھی دھندلا ہو تا گیا۔

جون ۱۹۸۸ء میں جب ناٹو کی فوج کی واپسی کا وقت قریب آجائے گا کیا سرب بوسنیائی سرزمین پر اپنا قبضہ برقرار رکھ پائیں گے؟ اس سوال نے امریکہ کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔ دریں اثناء مغرب کا یہ بھی احساس ہے کہ جنگ بندی سے سربوں کے بجائے بوسنیائی مسلمانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ انہیں اپنی قوت اور حوصلے منظم کرنے کے لئے وقت ملا ہے۔ اسلامی عقیدے کی طرف واپسی نے

بوسنیائی مسلمان خوب جانتے تھے کہ امن اس وقت ہماری نہیں بلکہ دشمنوں کی ضرورت ہے

انہیں اب ایک ناقابل تسخیر قوت میں تبدیل کر دیا ہے۔ گویا جس مسلم ریاست کا وجود مغرب ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا وہ ممکن نہ ہو سکا۔ تو کیا ایک بار پھر بوسنیا پر مغرب کے براہ راست حملے کا وقت آگیا ہے؟ ناٹو کے خونخوار پالیسی ساز کچھ اسی جانب اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اندیشے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ گزشتہ دنوں مغربی ذرائع ابلاغ نے منصوبہ بند طریقے سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا ہے کہ بوسنیائی مسلمان تیزی سے اسلحے جمع کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ بوسنیائی مسلمانوں نے ایسی خوفناک اسلحے جمع کرلئے ہیں جس سے سربوں کی زندگی کو سخت خطرہ ہو گیا ہے۔ لہذا امریکہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ ناٹو کی فوج کو مزید بوسنیا میں قیام کی اجازت مل جائے۔ اس امکان کو بھی یکساں رد نہیں کیا جاسکتا کہ اگر بوسنیا میں اسلام کا قلعہ اسی طرح مضبوط ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ مسلمانوں پر اسلحے کی ذخیرہ اندوزی کا الزام لگا کر براہ راست فوجی حملہ کر دیا جائے۔ اسلام سے خائف امریکی اور یورپی حکومتوں کے لئے یہ سب کچھ ممکن ہے۔ □

فلسطین میں قائد انقلاب کی واپسی

ایک ایسے معذور بوڑھے کی کہانی جس سے اب اسرائیل اور امریکہ خوف کھاتے ہیں

ایک ایسے شخص کا تصور کیجئے جو ضعیف العمری کی گوناگوں بیماریوں کا شکار ہو، جس کے قویٰ مضمحل اور اعضاء شل ہوں، جو پیروں سے مفلوج ذرا خود سے چلنے پھرنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو۔ ایک ایسے ہی بظاہر نحیف شخص سے اسرائیل اور امریکہ کو یہ شکایت ہے کہ اس نحیف و نزار شخص نے ہماری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ یہ شخص کوئی اور نہیں لاکھوں مسلم انقلابیوں کی آنکھوں کا تارا تحریک انتفاضہ کا قاعد شیخ احمد یاسین ہے۔ جسے گزشتہ دنوں اسرائیل کی حکومت نے تنگ آکر بالاخر رہا کر دیا ہے۔ وہ گزشتہ آٹھ سالوں سے اسرائیل کی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ اسرائیلی حکام ان کی عمر قید سے ان عزائم کی سرکوبی کا خواب دیکھ رہے تھے جو آج بھی امت کے نونہالوں میں فلسطین کی آزادی کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔

شیخ احمد یاسین کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فلسطین کی تحریک کو ایک ایسے وقت میں انقلابی رخ عطا کیا جب عرب دنیا میں یہ احساس عام ہو چلا تھا کہ اب فلسطینیوں کو ایک آزاد فلسطین کے خواب سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اسرائیل کی جنگی قوت اور امریکہ کی مسلسل پشت پناہی نے عام فلسطینیوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ اب اسرائیل ایک ناقابل تسخیر فوجی قوت ہے جس کے اشارے پر امریکی پالیسی ساز ادارے حرکت کرتے ہیں اور اس لئے شاید نہتے فلسطینیوں کے لئے فلسطین کی آزادی کی تحریک چلانا خودکشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ چھاپہ مار دستے، تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما بالاخر تھک ہار کر بیٹھ گئے اور انہوں نے یہ طے کر لیا کہ عسکری محاذ پر اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے اس جدوجہد کو محض ڈپلومیسی کی میز تک محدود رکھا جائے۔ لہٰذا وہ لوگ جو کبھی ارض فلسطین کی بازیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا اعلان کرتے تھے۔ وہ بھی بڑی حد تک فلسطین سے باہر عرب ملکوں میں اپنے علمی اور سیاسی امور کے دفاتر قائم کر کے بیٹھ گئے۔ ایک ایسے وقت میں احمد یاسین نے فلسطین کے غیور نوجوانوں اور بچوں کو توپ و تفنگ کے بجائے عزائم کے اسلحے سے لڑنے کی راہ دکھائی۔ شیخ یاسین کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ دشمن جدید ترین ٹیکنالوجی اور جدید طرز کے خودکار اسلحوں سے لیس ہے۔ فلسطینی نہتے اور بے بس ہیں اور یہ کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد ان کا مورال مسلسل روبہ زوال ہے۔ انہوں نے فلسطینیوں کی اس تباہ حالی اور بے بسی کے باوجود ایک منظم حکومت سے معرکہ آرائی کے لئے ایک ایسی عجیب و غریب ترکیب دریافت کی جس نے آنے والے دنوں میں حالات کا رخ بدل دیا۔



انتفاضہ کی تحریک نے اس وقت دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی جب ٹیلی ویژن کے پردوں پر چھوٹے چھوٹے بچے مسلح اسرائیلی فوجیوں پر کنکڑیاں پھینکتے دکھائے گئے۔ جہاں بھی کہیں کوئی موقع ملا فلسطینیوں کی نئی نسل نے اسرائیلیوں پر تاک کر کنکڑیاں دے ماری۔ کچھ ہی دنوں میں اسرائیل کی حکومت میں ہر طرف کنکڑیوں کی بارش سی ہونے لگی۔ بچوں کے لئے کنکڑیوں کا استعمال محض خالی اوقات کا مشغلہ نہ رہا بلکہ اسرائیل کی غاصب حکومت کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہاتھ آگیا۔ بہت جلد پوری فلسطینی قوم کے ہاتھ میں چھوٹے بڑے پتھر آگئے۔ پھر عام فلسطینی جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے انہیں بھی یہ حقیقت سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہمارا محض کنکڑیاں پھینکنا دشمن کی نیندیں حرام کر سکتا ہے۔ فلسطینی بچوں پر پولیس ڈنڈے برساتی رہی، اذیتوں کا سلسلہ جاری رہا جب کسی گھر سے کسی شہید کے لئے آہ و بکا بلند نہ ہوتی ہو، گویا ایک قیامت تھی جو فلسطینیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ لیکن ان کے ہاتھ میں کنکڑیاں بدستور موجود رہیں جو ہر لمحے اسرائیلیوں پر نشانے کی متلاشی تھیں۔ اسرائیل کی حکومت اس نئی صورت حال سے خوفزدہ ہو اٹھی۔ اسے جنگجوؤں سے لڑنے کا تو خوب تجربہ تھا اور گوریلا دستوں کو قابو میں کرنے کے لئے بھی اس نے بہت سا تجربہ حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن جب پوری قوم کنکڑیوں کی بارش شروع کر دے تو کس کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے اور کس کس سے انتقام لیا جائے۔ پھر کنکڑی کوئی ایسا اسلحہ بھی نہ تھی جسے تلاشی کا حکم دے

کرضبط کیا جاسکتا تھا۔ سب سے اہم اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ بوڑھا ہو یا بچہ، مرد ہو یا عورت ہر ہاتھ میں کنکڑی کی شکل میں ایک اسلحہ موجود تھا۔ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو گروہوں اور اشخاص سے تو لڑ سکتی ہے لیکن جب پوری کی پوری قوم اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اس سیلاب کا روکنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ حکومت اسلحے تو ضبط کرسکتی ہے اور ان اسلحوں سے بہتر اسلحہ بھی حاصل کرسکتی ہے لیکن عزائم کا ضبط کرنا اس کے لئے نہ تو ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی آج تک اسلحے کو عزم پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

آگے چل کر ان کنکڑیوں نے دھماکوں کی شکل اختیار کرلی۔ یہی نوجوان جو اسرائیل کے خلاف نفرت کا اظہار کنکڑیوں کے ذریعے کیا کرتے تھے اب تل ابیب کے عین قلب میں خوفناک دھماکوں پر اتر آئے۔ چند ہی برسوں میں ہر طرف دھماکے ہونے لگے۔ اسرائیل کی حکومت کو ایسا لگا کہ ان دھماکوں کا کنٹرول ان کے بس سے باہر ہے۔ پالیسی ساز اداروں میں یہ فکر پروان چڑھنے لگی کہ مسلسل خوف کے سائے میں زندگی جینا مشکل ہے اور چونکہ بزور بازو اس مسئلے کو حل کئے جانے کی ساری ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ فلسطینیوں کے ساتھ کچھ دے دلا کر معاملہ طے کرلیا جائے۔ اسی نئی فکر نے فلسطین میں ایک خود مختار فلسطینی ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ اسرائیل کی ایماء پر امریکہ نے امن مذاکرات کے ذریعے یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم کو ایک میز پر لا بٹھایا۔ شیخ احمد یاسین کی تنظیم حماس اس امن معاہدے سے متفق نہ تھی اس کا کہنا تھا کہ امن مذاکرات دراصل اسرائیل کی اپنی پریشانی کا حل ڈھونڈنے کے لئے منعقد کئے جارہے ہیں۔

کوئی حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو گروہوں اور اشخاص سے تو لڑ سکتی ہے لیکن جب پوری کی پوری قوم اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اس سیلاب کا روکنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔



عام طور پر فلسطینی اور اسرائیلی قیادت کے مابین امن مذاکرات سے یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ موجودہ دنیا میں جو کام جنگ کے میدان میں انجام نہیں پاسکتا انہیں مذاکرات کی میز پر انجام دیا جانا ممکن ہے۔ بعض سادہ لوح مسلم دانشور اس خیال کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ موجودہ دنیا میں بہت کچھ مذاکرات سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دشمن مذاکرات کی میز پر آپ کی بات اسی وقت سنتا ہے جب وہ جنگ کے میدان میں آپ کی قوت کا لوہا مان چکا ہوتا ہے۔ اگر اسرائیل کے لئے بزور بازو تحریک انتفاضہ کو کچل ڈالنا ممکن ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز مذاکرات کی میز تک نہ آتا اور نہ ہی یاسر عرفات کی سربراہی میں موجودہ خود مختار حکومت کا قیام ممکن ہوتا۔

ویلز چیئر پر چلنے والے احمد یاسین ہوں یا امریکی جیل میں مقید نابینا مصری عالم شیخ عمر عبدالرحمن ان دونوں ہی کی ذات سے امریکہ کو خوف آتا ہے اور دونوں اس شکست خوردہ منتشر امت کے اندر امید کی علامت ہیں۔ دشمن خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو پیروں سے معذور اور آنکھوں سے محروم لوگ بھی اسے اپنے عزائم کے اسلحوں سے خوفزدہ کرسکتے ہیں اور جب ایک فرد واحد احمد یاسین کی کوششوں سے فلسطین میں صورت حال بدل سکتی ہے تو پھر ہم اور آپ جیسے عام صحت مند لوگ جسے اللہ نے ہاتھ پیر سے نوازا ہے اس دنیا میں کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ جو اسرائیل مصر، شام کی منظم فوجوں کو زیر کرسکتا ہو اس کے لئے ایک معذور شخص پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ احمد یاسین کا عزم ناقابل تسخیر ہے۔ اس نے محض اللہ کی نصرت کے بھروسے ایک منظم حکومت کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیا اور جدوجہد کے سخت ترین ایام میں بھی اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔ آٹھ سال کی قید کے بعد جب وہ انتہائی خراب صحت میں جیل سے باہر آئے ہیں جب بھی ان کا عزم اسی قدر جوان ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ ہر قیمت پر اسرائیلی ریاست کا وجود ختم کرکے رہیں گے۔ مصالحت کی پیش کش پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے شیخ نے کہا کہ کوئی اگر آپ سے دو لاکھ ڈالر چھین لے اور اس میں سے صرف سو ڈالر واپس کرے تو صرف سو ڈالر کی واپسی پر غاصب سے سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کچھ تو ہے کہ اس اپاہج بوڑھے سے اسرائیل کی حکومت انتہائی خوفزدہ ہے۔

اسرائیل کا امن فارمولا در اصل دہشت گردی کا دوسرا نام ہے

اسرائیلی خفیہ ایجنٹ کے ایک ناکام مشن کی لمحہ بہ لمحہ روداد

اس واقعے کو اسرائیل کی خصوصی سروس کو عالم گیر شہرت عطا کرنے والے چند یادگار مہلک حملوں میں شمار کیا جائے گا۔ ہوا یوں کہ اسرائیلی انسٹی ٹیوٹ فار انٹلی جینس اینڈ اسپیشل ٹاسکس کے کارکنوں کو عمان میں مقیم معروف فلسطینی اسلامی انقلابی کو جان سے مارنے اور بغیر ثبوت چھوڑے فرار ہوجانے کا کام سونپا گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ ایسے آثار بھی چھوڑنا منظور نہیں تھا جس سے معلوم ہو کہ کوئی حملہ ہوا ہے۔ یہ پورا منصوبہ ناکام ہوگیا اور اسرائیلی وزیراعظم بنجامن نیتن یاہو کو مقامی اور عالمی غم و غصے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

واشنگٹن پوسٹ اور اسرائیلی اخبارات میں شائع ہونے والی تفصیل کے مطابق موساد کے دو کارکن حماس کے سیاسی ونگ کے لیڈر خالد مشعل کا تعاقب اسی وقت سے کر رہے تھے جب ۲۵ ستمبر کو عمان سے وہ اپنے گھر سے نکلے تھے۔ ان کا سرپوش شاید اسی وقت اڑ گیا تھا جب مسز مشعل نے مبینہ طور پر موبائل فون پر اپنے شوہر کو آگاہ کردیا تھا کہ جب وہ گھر سے نکلے تو دو آدمی ان کی کار کا تعاقب کرتے دیکھے گئے تھے۔ اس کے بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشعل نے اس تنبیہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا کیونکہ کار سے نکل کر وہ کوئی مزید احتیاط برتتے ہوئے سیدھے اپنے دفتر کی طرف بڑھنے لگے۔

مشعل کا بیان ہے کہ حملے کے بعد انہوں نے اپنے سر کے پیچھے اچانک کوئی آواز سنی اور خوف کی ایک لہر اس وقت ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی جب وہ اپنے آفس کے پاس چکر لگاتے ہوئے دو آدمیوں کے قریب سے گزرے اور پھر اس کے آگے کی یکجا رپورٹ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیلی ایجنٹوں نے مسٹر مشعل کو زہر کا انجکشن لگا دیا تھا۔



اپنے مشن کے پہلے حصے کی کامیابی سے تکمیل کے بعد اسرائیلی ایجنٹوں نے بقیہ حصے کو انجام دینے کی ترکیب کی۔ وہ اپنی کار میں سوار تو ہوگئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کار بدلیں، مشعل کے باڈی گارڈوں نے تعاقب کرکے انہیں پکڑ لیا۔ پہلے تو اردنی پولیس نے جن کے حوالے ان دونوں کو کیا گیا تھا اعلانیہ طور پر اس بیان پر یقین کرلیا کہ یہ مشعل اور ان دو آدمیوں کے درمیان ہاتھا پائی کا معاملہ تھا جو اپنے پاسپورٹ کی رو سے کناڈا کے شہری تھے۔ تاہم اردنی ذمہ داران اس بات سے آگاہ معلوم ہوتے تھے کہ وہ دونوں اسرائیلی ایجنٹ ہیں۔ اس حملے کے دس منٹ کے اندر اندر حمس نے فیکس پیغامات بھیجنے شروع کردئے کہ دونوں افراد واقعی اسرائیلی باشندے تھے اور کناڈا کی شہریت کا ڈھونگ رچاکر مشعل کو جان سے مار دینے کی کوشش کررہے تھے۔

اس دوران مشعل گر پڑے اور انہیں ایک ہسپتال کے آئی سی یو میں داخل کیا گیا۔ شاہ حسین نے شدید غصے کی حالت میں اسرائیل سے اس Nerve Poison کے تریاق کی فراہمی کا مطالبہ کیا جس کا انجکشن حمس لیڈر کو لگایا گیا تھا۔ مشعل کی زندگی کو خطرہ لاحق رہنے تک اسرائیل کی طرف سے ایجنٹوں کے بارے میں کی گئی کوئی درخواست سننے سے انہوں نے انکار کردیا۔ ایک اسرائیلی کالم نگار نے لکھا کہ انتہاپسندی کے خلاف شدید موقف اختیار کرنے کا سہرا باندھنے والے نتین یاہو کو ایک ایسے شخص کی زندگی کے لئے دعا مانگنے میں سات گھنٹے صرف کرنے پڑے جو اب تک ان کی نظر میں انتہاپسند تھا۔ شاہ حسین نے اسرائیلی وزیراعظم پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ انہوں نے امریکہ سے اس زہر اور اس کے تریاق کی تفصیل فراہم کرنے کے لئے کہا ہے۔

اگر کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی ہو تو اس پر مذمتوں کی بوچھار ہونے لگتی ہے لیکن اسرائیل کو دہشت گردی کا حامی ملک قرار دینے کی بات کرنا بھی کسی کو گوارہ نہیں۔

دونوں اسرائیلی ایجنٹوں کی رہائی وزیر اعظم نیتن یاہو کی اولین ترجیح بن گئی کیونکہ انہیں اسرائیل کے ہرتے سیاسی اور فوجی لیڈر کی طرف سے کئے گئے اس عہد کو نبھانا تھا کہ وہ اپنے کسی سپاہی کو میدان جنگ میں نہیں چھوڑیں گے۔ دونوں ایجنٹوں کی رہائی کی کوشش میں اپنے دو سینئر منسٹروں ارئیک شیرون اور اتزک مرڈوکی کے ہمراہ ۲۹ ستمبر کو عمان پہنچے۔ شاہ حسین نے نیتن یاہو کے استقبال سے انکار کر دیا جنہیں شاید شہزادہ حسن سے گفتگو کرنی تھی۔ تاہم وہ بعد میں شیرون سے ملے اور اسرائیلی ایجنٹوں کی رہائی کی شرائط ان کے سامنے رکھیں۔ اردنی تحویل میں دو اسرائیلیوں کی رہائی کے بدلے میں شاہ نے اسرائیلی حکومت سے حماس کے بانی اور اہم ترین لیڈر شیخ احمد یاسین کی رہائی، اردن میں مقیم ایک اور حماس لیڈر موسیٰ ابومرذوق کی غزہ پٹی کو واپسی اور اسرائیلی تحویل میں لئے گئے بعض فلسطینی اور اردنی افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

نیتن یاہو ان میں سے زیادہ تر مطالبات پر رضامندی کا اظہار کیا لیکن موسیٰ ابومرذوق کو غزہ پٹی واپس آنے کی اجازت سے انکار کیا۔ شیخ یاسین ہوائی جہاز سے عمان لائے گئے اور چند ہی روز بعد انہیں غزہ جانے کی اجازت مل گئی جہاں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اردنی اور فلسطینی نظربندوں کو مختلف مراحل میں رہا کیا جارہا ہے اگرچہ یہ کہ کر نیتن یاہو کو اب بھی ایک خراب معاہدے سے بہترین فائدہ اٹھانے کے لئے تیار کیا جارہا ہے کہ انہوں نے ایسے کسی شخص کو رہا نہیں کیا ہے جس کے ہاتھ اسرائیلی خون سے رنگے ہوئے ہوں۔

اس مہلک کارروائی نے اسرائیل کے مفاد کو کئی طرح سے نقصان پہنچایا ہے۔ اول یہ کہ اسرائیلی خفیہ سروس پر عدم مغلوبیت کا جو رنگ چڑھا ہوا تھا اب وہ کچھ زیادہ ہی ڈھل گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کارروائی نے عالم عرب میں اس کے واحد دوست اردن کے شاہ حسین کو اس سے متنفر کر دیا ہے۔

اگلے ماہ اردن میں پارلیمانی انتخابات ہونے والے ہیں اور انتخاب کا بائیکاٹ کرنے کے لئے اسلامی پارٹیوں کے فیصلے سے شاہ حسین خاصے فکرمند ہیں۔ اگر اس لمحے میں شاہ حسین اگر کسی خدمت کی پیش کش کر سکتے تھے تو وہ اس طرح کہ اردن کی سرزمین پر اسلامی لیڈر پر اسرائیلیوں کے حملے کی کوشش کے بعد وہ اسرائیل سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ شاہ حسین اس وجہ سے بھی زیادہ برہم ہوئے کہ یہ حملہ اسرائیل کو حماس کی طرف سے جنگ بندی کی پیش کش کے اشارے کے چند دن بعد ہی کیا گیا۔

اسرائیل کو یہ امید ہو سکتی تھی کہ شیخ یاسین کی غزہ میں واپسی میں کم از کم ایک اعتبار سے وہ فائدے میں رہے گا۔ ایک بار غزہ واپس آجانے کے بعد شاید حماس لیڈر فلسطینیوں کو یاسر عرفات کے مقابل ایک متبادل قیادت فراہم کریں گے اور اس طرح فلسطینی صدر کی حیثیت خود ان کے علاقوں میں ہی کمزور پڑ جائے گی جس سے اسرائیل کے لئے فلسطینی ذمہ داران سے گفت و شنید کے دوران ساز باز کی گنجائش نکل آئے گی۔ اس کے برعکس شیخ یاسین فلسطینیوں کو مٹھی کی طرح متحد ہو جانے اور یاسر عرفات کی قیادت پر قائم رہنے کی دعوت دی جنہیں شیخ نے ایک محب وطن اور فلسطینی جدوجہد میں بہت کچھ کرنے والے شخص سے تعبیر کیا۔ اسرائیل کا ایک اور بھی نقصان ہوا ہوتا جو امریکہ سے اس کے خاص تعلق کی وجہ سے نہیں ہوگا۔

اجنبی سرزمین پر کسی کو نروگیس کے حملے کا نشانہ بناکر اسرائیلیوں نے ایسے کتنے ہی ضابطوں کی خلاف ورزی کی ہے جو ان کا خاص دوست پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہ رہا ہے۔

اگر کسی مسلم ممالک کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی ہو تو اس پر مذمتوں کی بوچھار ہونے لگتی ہے لیکن اسرائیل کو دہشت گردی کا حامی ملک قرار دینے کی بات کرنا بھی کسی کو گوارہ نہیں۔ ▭

دو سانحے

○ **گزشتہ** سال ملی پارلیمنٹ کے سیاسی اجلاس میں رات کی تاریکی میں اسلام کے غلبے کے لئے رو رو کر دعائیں کرنے والے پاکیزہ نفوس میں اب ایک اور شخص اس دار فانی سے اٹھالیا گیا۔ اس مخلص اور دردمند ہستی کا نام حکیم عبدالستار روحانی تھا۔ جن لوگوں نے حکیم صاحب کی خدا ترسی کو قریب سے دیکھا ہوگا انہیں یقیناً یہ ایک ناقابل تلافی نقصان معلوم ہوگا۔ اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے آمین۔

○ دریں اثناء الہ آباد میں ملی ٹائمز کے بہی خواہ اور ملی پارلیمنٹ کے جواں سال کارکن برادر سیف الدین کے والد محترم جناب محمد ریاض الدین صاحب کے انتقال کی خبر بھی ہم تک پہنچی ہے۔ مرحوم گزشتہ چند ہفتوں سے بیمار تھے۔ قارئین ملی ٹائمز سے ان دونوں کرم فرماؤں کے لئے دعاؤں کی درخواست ہے۔



دستاویز

کیا اسلام خواتین کو سماجی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت دیتا ہے؟

گذشتہ سال حلقہ خواتین ملی پارلیامنٹ نے مسلم خواتین کا منشور شایع کیا تھا جس کی اشاعت کے بعد ہی ملک کے طول و عرض میں گویا بیداری کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ البتہ گذشتہ دنوں کیرالہ اور لکھنؤ میں خواتین کے مسجد میں داخلے کے مسئلے نے اب اس تحریک کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا ہے۔ رسول اکرمؐ کے اس واضح فرمان کے بعد کہ "اللہ کی بندیوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو" کتنے جری ہیں وہ لوگ جو بہنوں کو مسجد میں جانے سے روکتے ہیں۔

افادہ عام کی غرض سے ہم اس اہم دستاویز کو جوں کا توں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (ادادہ)

عصر حاضر میں مسلم خواتین کا منشور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جب امت اسلامیہ کا بنیادی ڈھانچہ منہدم ہے ، ملی سیاسی وحدت کا تصور پاش پاش ہو چکا ہے ۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جب کوئی پون صدی سے امت اسلامیہ کسی خلیفہ یا امام کے بغیر زندگی گزار رہی ہے ۔ ہماری سرزمین پر مغرب کے ایجنٹ قابض ہیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ تعالی نے مسلم دنیا کو فطری وسائل کے حیرت انگیز ذخائر سے مالامال کیا ہے ، واقعہ یہ ہے کہ ان وسائل کا کنٹرول بھی بڑی حد تک دشمن کے ہاتھوں میں ہے جو اسے مسلسل اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے استعمال کر رہے ہیں ۔ رہے وہ لوگ جو اسلام کی مرکزی سرزمین پر ایک بار پھر خلافت کے احیاء کا خواب دیکھتے ہیں تو ملکی اور بین الاقوامی صورت حال کے پیش نظر وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کرتے ہیں کہ ان کی مقدس آرزو دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی ہے ۔



ایک ایسی تکلیف دہ صورت حال میں ہر درد مند مسلمان مرد اور عورت کے ذہن میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے ؟ آخر یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک بار پھر اس منتشر امت کو سیاسی وحدت میں تبدیل کیا جائے ؟ یہ حقیقت بھی محل نظر رہے کہ شرعی اعتبار سے خلیفہ کے بغیر امت کی زندگی انتشار اور پراگندگی کی ایک ایسی صورت حال سے عبارت ہے جو دراصل ایک ہنگامی صورت حال کا خاصہ ہوا کرتا ہے ۔ خلیفہ کے بغیر کسی منظم اور متحد امت کا تصور نہیں کیا جاسکتا ۔ اس بات پر بھی فقہاء کا اتفاق ہے کہ عہدہ خلافت کو تین دن سے زیادہ کی مدت کے لئے خالی نہیں چھوڑا جاسکتا ۔ گویا موجودہ صورت حال میں ہم ایک ایسے عبوری ہنگامی دور سے گزر رہے ہیں جس میں آرام کا کوئی لمحہ اور سانس لینے کی کوئی مہلت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ خلافت کا قیام عمل میں نہیں آجاتا ۔

ہمارے لئے اس وقت جو سوال غور طلب ہے وہ یہ کہ موجودہ صورت حال میں اسلام کو ایک نئی زندگی عطا کرنے اور خلافت کے بنیادی ادارے کو دوبارہ اس سرزمین پر قائم کرنے کیلئے ایک ناقابل تسخیر تحریک کیسے برپا کی جائے ؟ ایک ایسی صورت حال میں جب کوئی پون صدی کی جدوجہد دین کے اس بنیادی ادارے کو دوبارہ قائم کرنے میں ناکام رہی ہو اس بات کی شدید ضرورت ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کو کامیابی کے حتمی مرحلے میں داخل کرنے کے لئے اپنی ساری توانائی اس میں جھونک دی جائے ۔ اپنی بساط بھر امت کے ہر فرد پر خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان ، چھوٹا ہو یا بڑا ، مرد ہو یا عورت ہر کسی پر یکساں طور پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد میں ضرور شریک ہو ۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب مردوں کی جدوجہد اسلام کو سربلندی عطا کرنے میں ناکام رہی ہو یا محض مردوں کی اجتماعی قوت دشمن کے مقابلے میں کم پڑ گئی ہو ، مسلم خواتین پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے معمول کی زندگی تج کر اس انقلابی جدوجہد میں اس وقت تک شریک رہیں جب تک کہ اسلام کی تحریک ایک فیصلہ کن کامیابی سے ہمکنار نہ ہو جائے ، اسلام ان سے اسی بات کا مطالبہ کرتا ہے اور قرون اولی کی مسلم خواتین نے اسلام سے اپنی اس درجہ وابستگی کا بارہا ثبوت پیش کیا ہے ۔

عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اسلام کی انقلابی جدوجہد میں مسلم خواتین کا کوئی بنیادی رول نہیں ہے ۔ اگر وہ زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتی ہے تو صرف یہ کہ اپنے مجاہد شوہر کی حوصلہ افزائی کرے یا انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں پیش آنے والے خطرات پر حرف شکایت زبان پر نہ لائے اور ہر صورت میں بیوی ، بیٹی یا ماں کی حیثیت سے انقلابی تحریک کے لئے اچھے جذبات اپنے دل میں رکھے ۔ رہا اپنی ذاتی حیثیت میں اس انقلابی جنگ میں شرکت کا معاملہ یا دین کی راہ میں مردوں پر سبقت لے جانے کا جذبہ تو اب اس کا خیال بھی مسلم خواتین کو کم ہی آتا ہے ۔ اسے زوال زدہ مسلم معاشرے نے جو کچھ بتایا ہے وہ صرف یہ کہ وہ بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کی مکمل تحویل میں ہے ۔ اسے اپنے طور پر نیک و بد میں تمیز کی حاجت نہیں ، کہ یہ کام بھی شوہر کی ذمہ داری ہے ۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ شوہر کی مکمل اتباع میں اپنا سر جھکائے رہے ، شوہر کی رائے اس کی رائے بن جائے اور وہ اپنی بقیہ زندگی ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے گزار دے جس کی اپنی کوئی انفرادیت نہ رہ گئی ہو ۔ رہا اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی توانائی صرف کرنے کا معاملہ تو مسلم معاشرے کی روایتی عورت کو اس بات کے لئے تیار ہی کب کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر کے معاملات پر گفتگو کر سکے ، یا دنیا میں پیش آنے والی تبدیلیوں پر نظر رکھے ۔

ہمارے موجودہ زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے رفتہ رفتہ بعض مقامی اقدار و تصورات کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے اندر اسلام کی بنیادی روح دب کر رہ گئی ۔ آج بیشتر مسلم معاشروں میں عورت کے تعلق سے جو تصورات رائج ہیں یا اس کے

لئے جو رول متعین کردیا گیا ہے اس کا تعلق اسلام سے کہیں زیادہ ان مقامی اقدار و تصورات سے ہے جسے ہم نے رفتہ رفتہ تقدس کے مرحلے تک پہنچادیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ عہدرسول کی عورت ہمارے معاشرے کی روایتی دیندار عورت سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ جو لوگ اسلام کو دوبارہ دنیا میں غالب دیکھنے کے آرزومند ہیں ان کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اسلام کی ہمہ گیر انقلابی تحریک کو مؤثر بنانے کے لئے پورے مسلم معاشرے کی قوت مستعار لیں اور مسلم خواتین کو بھی مقامی روایات سے اوپر اٹھ کر وہ رول دینے میں تکلف کا مظاہرہ نہ کریں جس کا اسلام ان سے مطالبہ کرتا ہے اور جس پر قرون اولی کی تاریخ شاہد ہے

ایک ایسے معاشرے میں جہاں اسلام کی تعلیمات مقامی روایات اور ثقافت میں اسطرح گڈمڈ ہوگئی ہو کہ عام مسلمانوں کے لئے ایک کا دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہوگیا ہو، جہاں فتنے کے خوف سے ان دروازوں کو بھی بند کردیا گیا ہو جسے اسلام نے کھلا رکھا تھا اور جہاں پوری امت احساس عدم تحفظ کی ایک ایسی نفسیات میں بستلا ہو کہ اس کے چوٹی کے علماء کرام بھی نفاذ شریعت کے بجائے تحفظ شریعت کی مہم چلاتے ہوں ایک ایسے معاشرے میں اسلام کو اس کی اصلی شکل وصورت میں برتنا اور عورت کو پھر سے اس انقلابی مشن کا حصہ بناڈالنا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ پھر جو لوگ عرصے سے سیاسی غلامی کی زندگی جینے کے عادی ہوں جو صرف تحفظ کی اصطلاحوں میں سوچتے اور مطالبات کی دنیا میں جیتے ہوں ان سے اس بات کی توقع کرنا کہ وہ نہ صرف خود اسلام کی عالمی سیادت کو پھر سے قائم کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانیوں کے ساتھ میدان میں آئیں بلکہ اس مشن میں اپنی مستورات کو بھی شریک کریں دراصل ایک بڑے فکری انقلاب کا طالب ہے۔ یہ اس بات کا طالب ہے کہ مسلم معاشرے کو ازسرنو کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم کردیا جائے۔ ایک طویل عرصے کی محکومی کے دوران جو باطل خیالات و تصورات رائج ہوگئے ہیں ان سے یکسر اجتناب کیا جائے، مسلم عورت کو وہ سب کچھ دیا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے دیا ہے اور مسلم عورت کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کرے جس سے اللہ اور اس رسولؐ نے اسے روک دیا ہے۔ "اور رسولؐ تمہیں جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ"

مسلم بہنوں پر لازم ہے کہ احکام الہی کی بجاآوری میں وہ ہر قسم کی مقامی رکاوٹوں اور ثقافتی دشواریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں ان کے لئے اگر کوئی چیز اہمیت رکھتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک مومنہ کی حیثیت سے قرآن سے انہیں کیا ہدایت ملتی ہے اور آپؐ کے عہد میں صحابیات نے ان احکامات کو کس طرح برتا۔ یعنی ہدایت کا بنیادی ماخذ قرآن ہے اس کے بعد وہ تمام احادیث اور واقعات جو قرآن کی ان ہدایتوں کی توثیق کرتے ہوں۔ رہی بعد کے عہد میں فقہا کی وہ آراء جو احتیاط فتنے کے سدباب کے لئے عورت کو بعض ذمہ داریوں سے سبکدوش کرتی ہیں یا مسجد میں اس کے عمل دخل پر روک لگاتی ہیں تو یہ ان حضرات کی اپنی سمجھ تھی، ان کا اپنا اجتہاد تھا جو ان کے مخصوص ماحول کے لئے ہوسکتا ہے مناسب رہا ہو، البتہ اسے کوئی دائمی حیثیت نہیں حاصل ہوسکتی۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا فقیہ یا عالم ایک خاص عہد تک دیکھتا ہے، وہ اپنے عہد کے لئے اپنی محدود فہم کی روشنی میں ہدایات مرتب کرتا ہے اس کی سمجھ کو بعد کے بدلے ہوئے حالات میں بھی یکساں معتبر گرداننا مناسب نہیں۔ ہمارے لئے تو صرف یہ کافی ہے کہ کسی بارے میں اللہ کی کتاب کیا کہتی ہے اور رسولؐ کی سنت سے اس کی تشریح کس طرح ہوتی ہے اور بس۔ رہی مختلف عہد کے فقہائے عظام اور علمائے کرام کی آراء تو اسے استفادے کے لئے بیش قیمت سرمائے کی حیثیت تو حاصل ہوگی لیکن حکم کی نہیں۔ اللہ کی کتاب جب تازہ بہ تازہ ہمارے درمیان موجود ہے تو ہمیں یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ کسی اور کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھیں۔

اس بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام مسلم مرد کی طرح مسلم عورت کے ایمان کو بھی اس کا انفرادی معاملہ قرار دیتا ہے۔ یعنی مسلم مرد کی طرح مسلم عورت بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے اپنی وابستگی کا اقرار کرتی ہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عہد کرتی ہے۔ گویا مسلم عورت کا ایمان اپنا انفرادی عمل ہے اس کے اس عمل کا شوہر، بھائی یا باپ سے کچھ بھی علاقہ نہیں وہ اپنے ہر عمل کے لئے جزا و سزا کی خود مستحق ہے، مرد کا نیک عمل اس کے لئے کافی نہیں ہے

اسلام کی تحریک میں عورت کا کردار ضمیمے کے طور پر نہیں ہے بلکہ اسے بھی مرد کی طرح بنیادی رول عطا کیا گیا ہے۔ قرآن تو اس بات کا برملا اعلان کرتا ہے کے اسلام کی تحریک عورتوں کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بھرپور اسلامی تحریک کے لئے ضروری ہے کے پورا مسلم معاشرہ ایک اکائی کے طور پر کفر سے نبزد آزما ہونے کے لئے متحرک ہوجائے اور ایسا محسوس ہونے لگے گویا مرد اور عورت الگ الگ سیارے کی مخلوق نہیں بلکہ ایک ہی تحریک کے اجزائے ترکیبی ہیں، ایک دوسرے کے مونس و غمگسار ہیں۔ ایک کو دوسرے سے تقویت ملتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے معاون ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس رسولؐ

> **جب مردوں کی جدوجہد اسلام کو سربلندی عطا کرنے میں ناکام رہی ہو یا محض مردوں کی اجتماعی قوت دشمن کے مقابلے میں کم پڑ گئی ہو، مسلم خواتین پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے معمول کی زندگی تج کر اس انقلابی جدوجہد میں اس وقت تک شریک رہیں جب تک کہ اسلام کی تحریک ایک فیصلہ کن کامیابی سے ہمکنار نہ ہوجائے**

کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی یقیناً اللہ سب پر غالب ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

گویا قرآن کی نظر میں اللہ کے دین کے لئے جدوجہد کرنے والے مرد اور عورت مشترکہ طور پر ایک ایسے مقدس مشن کے لئے جدوجہد کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اللہ کی رحمت کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں کا الگ الگ تذکرہ کرکے اس بات کی مزید وضاحت کردی گئی کہ اسلام کے غلبے کی تحریک میں عورتوں کا مطلوبہ رول مردوں سے کسی قدر کم اہمیت کا حامل نہیں۔ دور اول کے اہم معرکوں میں شاید ہی کوئی ایسا معرکہ ہو جس میں مسلم خواتین اپنی بساط بھر مردوں کے لئے باعث نصرت و تعاون نہ بنی ہوں۔ یہ تعاون کبھی مالی شکل میں سامنے آیا تو کبھی شعروادب نے اس کی شکل لی اور کبھی جسمانی مشقت نے اس کا حق ادا کیا۔ عام طور پر تاریخ کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور صحابیات کی شرکت کا تذکرہ اس حوالے سے ملتا ہے کہ وہ فوجیوں کے لئے کھانا بناتیں، انہیں پانی پلاتیں یا زخموں کی مرہم پٹی کا کام انجام دیتیں۔ البتہ ذاتی طور پر براہ راست جنگوں میں شرکت کا تذکرہ ہمارے مؤرخین کی توجہ کا موضوع کم ہی بنتا ہے۔ جس پر ہم انشاء اللہ آگے روشنی ڈالیں گے۔

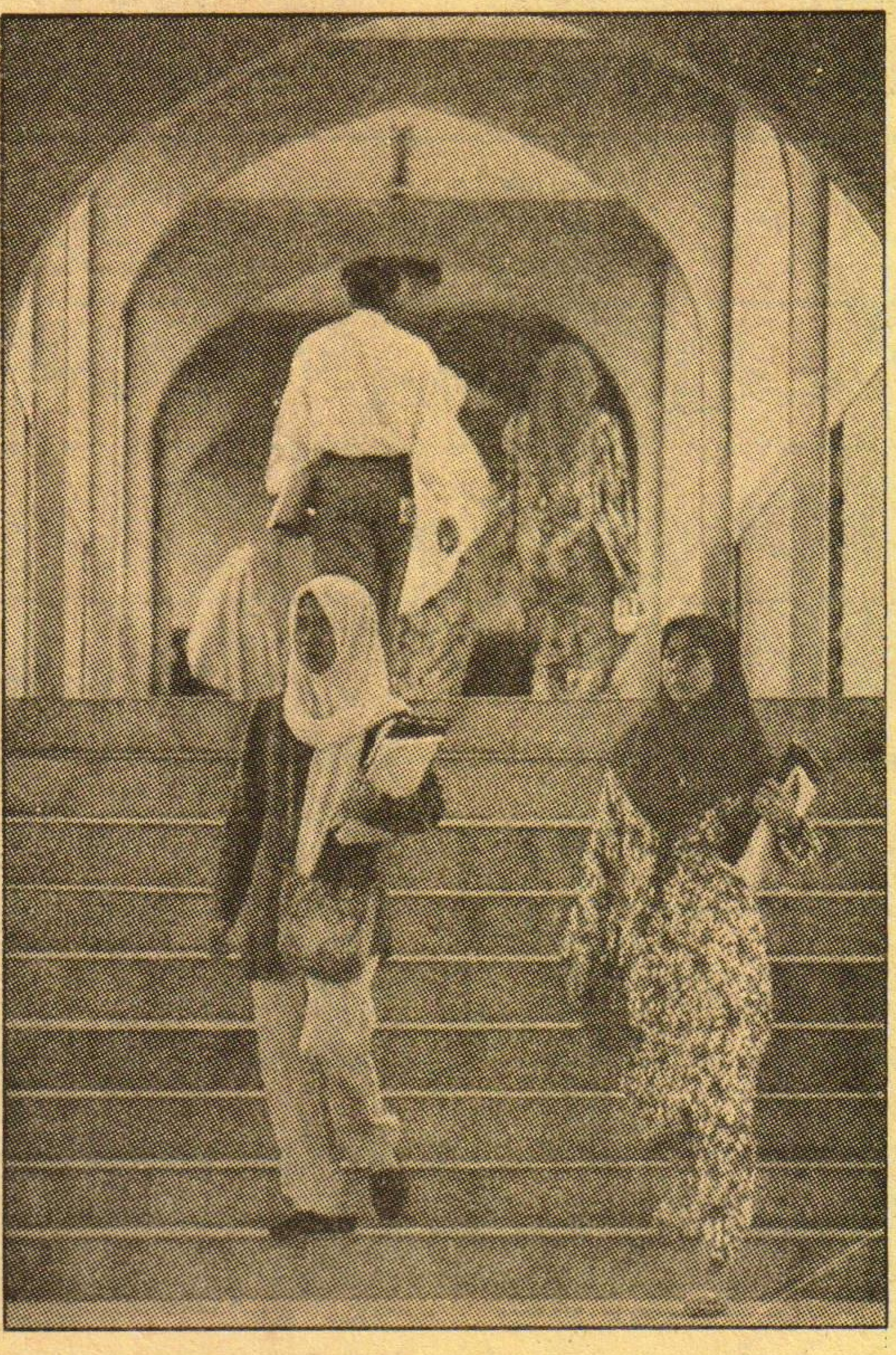
یہاں ہم صرف اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی تحریک میں مرد کی طرح عورت بھی ایک بنیادی رول کی حامل ہے۔ جس طرح شوہر کا ایمان لے آنا بیوی کے لئے کافی نہیں ہوسکتا یا بھائی کی عبادت گزاری بہن کے لئے ذریعہ نجات نہیں بن سکتی اسی طرح غلبہ اسلام کی تحریک میں بھی عورت کا اجر ذاتی حیثیت میں اس کی اپنی شرکت پر منحصر ہوگا۔ اور فریضہ اقامت حق سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ذاتی حیثیت میں اس کی اپنی شرکت لازمی ہوگی۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو لہذا جن لوگوں نے میری خاطر وطن چھوڑا اور میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے" (آل عمران ۱۹۵)۔

اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنا، ستایا جانا، لڑنا، مارا جانا صرف مردوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ یہ ساری سعادت بالکل اسی سطح پر عورتوں کے حصے میں بھی آتی ہے یعنی اللہ کے یہاں درجات کا تعین اس کی راہ میں جدوجہد کرنے پر منحصر ہے۔ مرد اور عورت یکساں طور پر اس انعام کے مستحق ہیں اور یکساں طور پر دونوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں عزیمت بھرے اس راستے کو منتخب کرکے عظیم بشارت کے مستحق ہوں۔ دوسری جگہ اس بات کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا گیا۔

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اگر وہ مومن ہے تو ہم دنیا میں اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخش دیں گے" (النحل، ۹۷)

قرآن کی اس صریح ہدایت کے بعد کہ اللہ کی راہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی گھر بار چھوڑنا ہوگا، دشمنوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا ہوگا اور مرنے مارنے کے لئے ہم دم تیار رہنا ہوگا، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عورت اس راہ کو اختیار کئے بغیر آخرت میں بہترین کامیابی کی توقع رکھے؟ یا دور جدید کی اسلامی تحریک مومن عورت کو اس راہ عزیمت سے کنارہ کش ہونے کی ترغیب دے جس پر چل کر وہ اللہ کے بہترین وعدوں کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ خاص طور پر قرآن کے ان صریح ارشادات کے پیش نظر کہ انسانوں کی مغفرت کا فیصلہ گروہی، نسلی یا جنسی بنیادوں پر نہیں بلکہ ان کے ذاتی اعمال کی بنیادوں پر ہوگا۔ "قیامت کے دن ہر شخص اس کے حضور تنہا پیش ہوگا" (مریم ۹۶) کیا ایک باشعور مسلم خاتون کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس دن کی ابھی سے تیاری کرے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "اس دن آدمی اپنے سگے بھائی، باپ، بیوی اور بچوں سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ اس دن ہر شخص کو بس اپنی اپنی پڑی ہوگی" (عبس ۳۸-۳۵)



ذرا غور کیجئے!

ایک طرف تو قرآن کا یہ اصرار کہ وہ نجات کے لئے انفرادی سرمایہ عمل کو لازم قرار دیتا ہو۔ اللہ کی راہ میں پیش آنے والے مصائب پر ابدی کامیابی کی بشارت دیتا ہو اور اس بارے میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہ کرتا ہو اور دوسری طرف موجودہ مسلم معاشرے پر ایک نظر ڈالیے تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ پورا مسلم معاشرہ کیا مرد کیا عورت، کیا عالم کیا جاہل، کیا روشن خیال اور کیا قدامت پرست ہر شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ غلبہ اسلام کی تحریک میں عورت کا کوئی کلیدی رول نہیں ہوسکتا یہ تصور عام ہے کہ موجودہ نظام باطل کو اکھاڑ پھینکنے کی ذمہ داری عورت کے سر نہیں ہے اس کا دائرہ کار صرف اور صرف گھر کی چاردیواری کے اندر ہے باہر کی دنیا سے اسے کیا مطلب۔ رفتہ رفتہ گذشتہ چند صدیوں کے دوران اس تصور کو اتنا اعتبار حاصل ہوگیا ہے کہ اب اس مسئلہ پر کسی نئے تناظر میں غور و فکر کی ضرورت کم ہی سمجھی جاتی

۔ حالات خواہ کتنے ہی بدل گئے ہوں، امت پر حالات کتنے ہی دل گرفتہ کیوں نہ ہوں اور ہمارے اندر اسلام کو دوبارہ غالب دیکھنے کی کتنی ہی شدید آرزو کیوں نہ ہو ہمارے قلب ونظر پر روایت پرستی کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ زوال زدہ مسلم معاشرے کو دوبارہ اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی ہر خواہش کوئی عملی شکل لینے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ زوال کی ہر علامت کی حفاظت میں مصروف ہے، اسے یہ خوف کھائے جارہا ہے کہ مغرب سے اٹھنے والی ثقافتی آندھی جو اس کے بوسیدہ خیموں میں قیامت کا سماں برپا کئے دیتی ہے، بہت جلد ہمارے معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجادے گی۔ تحفظ کا یہ عمل اتنا شدید ہے کہ ہمارے روایتی علمائے کرام نے عورت کو بعض ان حقوق سے محروم کردیا ہے جو اسلام انہیں عطا کرتا ہے۔ روایتی طرز کی کتابیں دیکھ جائیے تو وہاں آپ کو اس طرح کے عنوانات سے بھی سابقہ پیش آئے گا مثلاً "عورتوں کو مسجد میں داخلے سے ممانعت کا حکم" جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ "اللہ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکو"۔

ہمارے خیال میں مغرب کی ثقافتی یلغار کو روکنے اور اس اخلاق باختہ سیلاب سے خود کو بچانے کے لئے نہ تو کوئی مصنوعی طریقہ کارگر ہوسکتا ہے اور نہ ہی موجودہ از کار رفتہ روایتی مسلم معاشرے میں یہ قوت ہے کہ وہ اپنی خود ساختہ اقدار کی بنیاد پر اس کا مقابلہ کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی ڈانٹ ڈپٹ اور روایات کی دہائی دینے کے باوجود ہمارا معاشرہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، آپ مسلم عورت کو مقفل رکھنے کی کتنی ہی ترکیبیں کرتے رہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام عورت کی طرح باہر کی دنیا میں اپنا رول تلاش کررہی ہے۔ آخر زندگی کا کون سا شعبہ ہے جہاں آج امت کی بہو بیٹیاں نظر نہ آتی ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ باہر کی دنیا میں اپنا رول تلاش کرلینے والی مسلم خاتون کی رول ماڈل کی تلاش میں اسلام سے کہیں زیادہ مغرب کی طرف دیکھتی ہے۔ بسا اوقات مسلم معاشرے سے اس کا رشتہ کٹتا نہیں تو کمزور ضرور پڑجاتا ہے۔ گویا آپ ثقافتی اقدار اور روایات کی جتنی بھی حفاظت کریں، اسے علماء کے قال اللہ قال الرسول سے جتنا بھی مزین کرلیں دین اور شریعت کے حوالے سے موجودہ زوال زدہ مسلم معاشرے کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے لئے جتنی سرتوڑ جدوجہد بھی کرڈالیں ان میں اب اتنی قوت نہیں کہ تبدیلی کی آندھیوں کا مقابلہ کرسکے۔

گذشتہ پچاس برسوں کی سیاسی غلامی اور بے بس محکومی کے دوران آپ کے خود ساختہ ثقافتی دائرے میں آخر کون سی چیز صحیح سالم رہ گئی ہے؟ آپ نے اپنی خواتین کو گھروں میں مقفل کرنا چاہا تو وہ باہر نکل آئیں، آپ نے لڑکیوں کے لئے جدید تعلیم کی سختی سے مخالفت کی لیکن دیکھتے دیکھتے جدید دانش گاہوں میں ان کی چلت پھرت عام ہوگئی۔ آپ نے معاشی اور سیاسی اداروں میں ان کی سرگرمی پر روک لگائی لیکن مسلم خواتین کی ایک قابل محسوس تعداد ان اداروں کے دروازوں پر دستک دیتی نظر آئی۔ آپ نے بھی ان سے کچھ زیادہ تعرض نہ کیا۔ آپ اس بات کو تو مستحسن نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کی بیٹی مخلوط میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرے البتہ جب کبھی بھی آپ کو خاتون ڈاکٹر کی ضرورت پیش آئی آپ نے مسلم خاتون ڈاکٹر سے رجوع کرنا مناسب سمجھا۔ اسی طرح ایک طرف تو آپ وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیئے بیٹھے تھے لیکن شریعت کے "تحفظ" کی خاطر جب بھی پرسنل لابورڈ کا جلسہ بلایا گیا اس میں تجربہ کار مسلم وکیلوں کی شمولیت بھی لازم سمجھی گئی۔ گویا آپ یہ تصور کئے بیٹھے تھے کہ آپ کی "اسلامی" ہدایت عمل کے لئے نہیں ہے عمل کی شریعت کچھ اور ہے اور نصیحت کی کچھ اور۔ کہ اگر آپ کے فرمودات پر امت نے واقعی عمل کیا ہوتا تو شریعت کے تحفظ کے لئے مسلم وکیل اور پردہ نشین مسلم خواتین کے لئے "بے پردہ" مسلم خاتون ڈاکٹر کہاں سے دستیاب ہوتی؟

> **ہمارے موجودہ زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے رفتہ رفتہ بعض مقامی اقدار و تصورات کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے اندر اسلام کی بنیادی روح دب کر رہ گئی۔ عہدرسول کی عورت ہمارے معاشرے کی روایتی دیندار عورت سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔**

ثقافت کی اسی آندھی کو روکنے میں اگر آپ واقعی مخلص ہیں تو اس کا مقابلہ روایت پرستی کے ہتھیاروں سے مت کیجئے جب آپ کے پاس اسلام کی زبردست انقلابی قوت موجود ہے جو ہر ثقافت اور تہذیبی اظہار کو مات دے سکتا ہے تو آخر آپ کو مدافعت کی جنگ لڑنے پر اس قدر اصرار کیوں ہے؟ اگر آپ کا اسلام مغرب کی مصنوعی آندھی اور مشرق کے سرابی عہد کے آگے ڈھیر ہوا جاتا ہے۔ یا آپ کی بہو بیٹیاں اسلام سے کہیں زیادہ مغرب کے نظام میں امان محسوس کرتی ہیں اور اگر آپ کی مصیبت زدہ بیٹیاں انصاف کی تلاش میں شرعی عدالتوں کے بجائے باطل عدالتوں سے رجوع کرتی ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ اب اس اسلام کے علمبردار نہیں رہے جس میں عورتوں کو اتنا کچھ مل گیا تھا کہ صحابہ کرام کو احساس ہونے لگا تھا کہ اسلام آنے کے بعد عورتیں ان کے کنٹرول سے گویا نکل گئی ہیں۔ عورت کی انفرادی آزادی اور اس کے حقوق کے تحفظ کی ایک ایسی مثال قائم ہوئی تھی کہ دنیا اور آخرت میں سرخروئی کے لئے کسی کا محض عورت ہونا اس کے لئے رکاوٹ نہ بن سکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ غلبہ اسلام کی تحریک میں اپنے لئے وہ رول ضرور متعین کرے جس کا اللہ اور اس کا رسول ان سے مطالبہ کرتا ہے۔ ورنہ اپنے ثقافتی اقدار کو اسلام بتا کر نہ تو آپ اسلام کی کوئی خدمت کررہے ہوں گے اور نہ ہی اس باد مخالف کا روکنا آپ کے لئے ممکن ہوگا۔

عصر حاضر کی باشعور مسلم تحریکیں ہوں یا زوال زدہ مسلم معاشرہ، عورت کے

مطلوبہ رول کے سلسلے میں دونوں کے ہاں حقیقت پسندی کا فقدان ہے ۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اسلام کے حوالے سے ایک نئی تبدیلی کے خواہاں ہیں ان کے یہاں بھی عورت کا اسلامی رول روایتی رول میں دب کر رہ گیا ہے ۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ جس امت میں کبھی خواتین علماء کی قابل ذکر تعداد رہی ہو، جہاں [illegible] باضابطہ درس و ارشاد کے منصب پر فائز رہی ہوں اور وقت کے امام ان کے درس سے اکتساب فیض کرتے ہوں، جہاں پالیسی امور میں خواتین سے مشورہ لینے کی روایت رہی ہو، جہاں میدان جنگ میں عورتیں مسلم فوج کی سپلائی لائن اور سپورٹ گروپ کے طور پر کام کر رہی ہوں، جہاں امت کے ہر سیاسی و سماجی نوعیت کے اہم پبلک پروگراموں میں خواہ وہ رسولؐ کا آخری خطبہ ہو یا مسجد نبوی میں انقلابی ہنگامی نوعیت کے اجلاس اور علمی مجالس، جمعہ کی نماز ہو یا عیدین کی بھیڑ بھاڑ، عورتیں ہر جگہ نظر آتی ہوں، اسی امت کی موجودہ نسل پر غفلت اور جہالت کا ایک عام ماحول طاری ہے ۔ حتیٰ کہ ہماری دیندار بہنوں کے تصور میں بھی یہ بات کم آتی ہے کہ امت اسلامیہ کو موجودہ زوال سے نکال لے جانے اور ایک بار پھر اسلام کی مرکزی خلافت کے قیام کی ذمہ داری مردوں کی طرح ان کے اوپر بھی عائد ہوتی ہے ۔ غلبہ اسلام کی مقدس مہم میں مومن عورتوں کو پھر سے مومن مردوں کا معاون و مددگار بنانے اور ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک برپا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم ان کج فہمیوں کا ازالہ کریں جو عورت کے حوالے سے روایتی مذہبی حلقوں میں عام ہو گئی ہیں اور جسے رفتہ رفتہ عقائد کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

عورت کا دائرہ کار

اس سلسلے میں ایک بنیادی غلط فہمی عورت کے دائرہ کار سے متعلق پائی جاتی ہے ۔ یہ تصور عام ہے کہ عورت کا دائرہ کار صرف اور صرف گھر کی چار دیواریوں تک ہی محدود ہے اس سے آگے جو کچھ ہے وہ مرد کی دنیا ہے اس میں دخل دے کر عورت عورت نہیں رہ جاتی ۔ اس سے پہلے کہ ہم اس مفروضے کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ قرآن مجید اس بارے میں کیا کہتا ہے ایک بنیادی مسئلہ کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں ۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ مرد اور عورت کو جسمانی ساخت میں اللہ نے ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے ۔ افزائش نسل کا جو فریضہ اسے عطا کیا گیا ہے یہ صرف اس کا طرہ امتیاز ہے اسے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا ۔ فی نفسہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے جس کے بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے اسے زندگی کے بعض دوسرے امور میں رخصت دے دی گئی ہے ۔ مثلاً کسب معاش کی فکر سے اسے آزاد کر دیا گیا، مخصوص ایام میں عبادت میں سہولت دی گئی یہاں تک کہ جہاد جیسے اہم فریضے کو اس کے لئے اختیاری عمل قرار دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ عورت کے اوپر افزائش نسل کی جتنی بھاری ذمہ داری دی گئی ہے انصاف کا تقاضہ تھا کہ دوسری ذمہ داریوں سے اسے رخصت دی جاتی۔

لیکن افزائش نسل عورت کا بنیادی فریضہ ہے، یہ اس کا Essential Role ہے، اس کی زندگی کا ماحصل نہیں۔ جس طرح ایک کسان کا بنیادی فریضہ غلہ پیدا کرنا، استاد کا بنیادی کام پڑھانا اور طبیب کا بنیادی رول علاج و معالجہ ہوتا ہے اسی طرح عورت کا بنیادی رول افزائش نسل ہے ۔ اور جس طرح کوئی کسان یا استاد یا طبیب اپنے اپنے بنیادی دائرہ کار سے آگے کی دنیا میں اپنا وجود رکھتے ہیں اسی طرح عورت اپنے اس پرائمری رول کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں متحرک کردار کی حیثیت سے چلتی پھرتی نظر آتی ہے ۔ صرف افزائش نسل پر اس کا رول ختم نہیں ہو جاتا۔ اسلامی تحریک کو پیش آنے والے خطرے میں نئے راستے کی تلاش کی ذمہ داری مردوں کی طرح اس پر بھی عائد ہوتی ہے ۔ جب اسلامی سرحدوں پر دشمن کی فوجیں مسلسل حملہ آور ہوں یا جب قوت اسلامی کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اور فدائین اسلام کی تحریک موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہو اس وقت کوئی مذہبی رہنما، کوئی ٹکنوکریٹ، کوئی طبیب یا مختلف بنیادی فریضے کے حاملین یہ کہہ کر اپنا دامن نہیں بچا سکتے کہ یہ کام اس کے بنیادی وظیفے میں شامل نہیں ہے ۔ یہ تو خیر ایک ہنگامی صورت حال کی مثال تھی اسلام تو معمول کی زندگی میں بھی ہر شخص سے اس کے بنیادی وظیفے کے علاوہ ایک سرگرم داعی کی زندگی کا طالب ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ گھر کی چار دیواری عورت کا بنیادی میدان ہے، افزائش نسل اس کا بنیادی فریضہ ہے کہ فطرت نے اسے ماں بننے کی صلاحیت سے مزین کیا ہے البتہ اگر کوئی اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اس بنیادی فریضے کی ادائیگی کے بعد مسلم معاشرے میں اس کا رول ختم ہو جاتا ہے تو دراصل وہ اسلام سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے، وہ عہد رسولؐ کی اس عظیم ثقافت سے انکار کرتا ہے جو عورت اور مرد کی مشترکہ جدوجہد سے وجود میں آئی تھی۔



آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ خدا کی کتاب عورت کے دائرہ کار کا تعین کس طرح کرتی ہے ۔ جو لوگ عورت کے دائرہ کار کو صرف گھر کی چار دیواریوں تک محدود کئے دینے کے قائل ہیں وہ اپنے نقطہ نظر کی صحت کے ثبوت میں سورہ احزاب کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، **وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیه الاولی**۔ اس سے پہلے کہ ہم اس آیت پر روشنی ڈالیں ہم یہ چاہیں گے کہ آپ بذات خود اس آیت کو پورے سیاق و سباق میں ملاحظہ فرمائیں۔

اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ دنیا کے مزے چاہتی ہو اور

اس کی چمک دمک تمہیں عزیز ہے تو آؤ ہم تمہارے لئے ان آسائشوں کا انتظام کردیں اور تمہارے معاملے سے بطریق احسن دستبردار ہوجائیں۔ البتہ اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی چاہ ہے تو واضح رہے کہ اللہ نے تم میں سے بہتر عمل والوں کے لئے اجر عظیم تیار کررکھا ہے۔

اے نبی کی بیگمات! اگر تم میں سے کوئی کھلی اخلاقی خرابی کا شکار ہوتی ہے تو اس کی سزا دوگنی کردی جائے گی اور ایسا کرنا اللہ کے لئے بالکل آسان ہے اگر تم میں سے کوئی اللہ اور اس کے رسول کا راستہ اختیار کرتی ہے اور نیک عمل کرتی ہے تو ہم اسے دوگنے اجر سے نوازیں گے اور ہم نے اس کے لئے رزق کریم تیار کررکھا ہے۔

اے نبی کی بیگمات! تم کسی اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دلفریب انداز سے گفتگو نہ کیا کرو مبادا بیمار دل کا کوئی شخص لالچ میں بسلا ہوجائے۔ بلکہ دوٹوک انداز سے بات کرو۔ اور اپنے گھروں میں باوقار انداز سے بیٹھو اور دور جاہلیت کی طرح دلکشا سج دھج کا مظاہرہ نہ کرو اور نماز قائم کرو، زکواۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے تمام آلائشیں دور کردے اور تمہیں پوری طرح پاک کردے۔ اور ذکر جاری رکھو اللہ کی ان آیات اور حکمت کی ان باتوں کا جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ کہ بے شک اللہ توجہ فرمانے والا اور باخبر ہے۔

قران کا کوئی بھی باذوق قاری اور عربی زبان کی معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی باسانی سمجھ سکتا ہے کہ ان آیات میں تکرار اور تواتر کے ساتھ بار بار نبی کی بیویوں کو خطاب کیا جارہا ہے۔ انہیں اس بار عظیم کا احساس دلایا جارہا ہے جو نبی کی بیوی ہونے کی وجہ سے ان پر آن پڑا ہے۔ اس سورہ کی ابتداء میں انہیں امت کی مائیں قرار دیا گیا ہے۔ بھلا اتنے عظیم منصب پر فائز عورتوں سے عام مومن عورتوں کے مقابلے میں کہیں بڑھ چڑھ کر صالح عمل کی توقع کیوں نہ کی جائے؟ لہذا انہیں بار بار اس بات کا احساس دلایا جارہا ہے کہ تم عام دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو تمہارے لئے صالح زندگی کا معیار عام صالح زندگی سے بالکل مختلف ہے یعنی تمہاری لغزش کے لئے دوگنی سزا ہے اور تمہارے نیک عمل کے لئے دوہرا اجر۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو نبی کی بیویوں کے علاوہ کسی دوسری عورت کو حاصل نہیں۔ عام مومن عورتوں کے مقابلے میں نبی کی بیویوں کو محتاط رہنے کو کہا گیا ہے وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تم اہل بیت کو آلائشوں سے پوری طرح پاک کردینا چاہتا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے میں نبیؐ کی عورتیں خصوصی اعزاز واکرام کی مستحق ہیں، یہ اپنی نوعیت کی واحد روحانی فیملی ہے جو پیشوائی کے منصب پر فائض ہے۔ لہذا ان کے لئے بہتر ہے کہ اپنے گھروں میں وقار سے بیٹھیں کہ ان کا یہ گھر عام گھر نہیں ہے بلکہ وہ مبارک جگہ ہے جہاں وقت کا رسول انہیں خدا کی آیات سناتا ہے اس لئے ان سے یہ مطالبہ ہے کہ اس عظیم اعزاز سے فائدہ اٹھائیں

ع جن کا رتبہ ہے سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

اب اگر کوئی شخص عام مومن عورتوں کو اسی منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے اور ان کے لئے گھروں سے نکلنے کو ممنوع قرار دیتا ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ عام عورتوں کے لئے بھی دوہرے اجر کی ضمانت لائے جیسا کہ رسول کی بیویوں کے لئے اللہ کا وعدہ ہے۔ اگر یہ آیات رسول کی بیویوں کے لئے صراحت سے ایک سخت معیار قائم نہیں کرتیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ اسی سورۃ میں آگے کی آیات میں خصوصیت کا طرز مخاطب عمومیت سے بدل گیا ہے۔

اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور عام مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈال لیا کریں یہ بہتر ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں تکلیف نہ پہونچے۔ (الاحزاب ۵۹)

مسلم عورت کو وہ سب کچھ دیا جائے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے دیا ہے اور مسلم عورت کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کرے جس سے اللہ اور اس رسولؐ نے اسے روک دیا ہے۔

یہ بات بھی محل نظر رہے کہ جن آیات میں خصوصیت سے نبی کی بیویوں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں زندگی جینے کے اصول بہت سخت ہیں، وہاں اس بات کی ترغیب ہے کہ نبی کی عورتیں بے وجہ بھٹکتی نہ پھریں البتہ مذکورہ بالا آیت میں جہاں مسلم خواتین کو عمومی طور پر خطاب کیا گیا ہے وہاں عجیب بات یہ ہے کہ گھروں میں بیٹھنے کے نہیں بلکہ باہر نکلنے کے آداب بتائے گئے ہیں۔ گویا معاشرے میں عورت کی چلت پھرت کو تسلیم کرتے ہوئے ان امور کی طرف واضح رہنمائی دے دی گئی ہے جو اسلامی معاشرے کو جاہلی معاشرے سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہاں سڑکوں پر نظر آنے والی عورت، عورت کا اشتہار نہیں ہوتی بلکہ زینت کو جلباب سے تحفظ دے کر عفت وتقدس کی پیکر بن جاتی ہے۔ نساء النبی اور نساء المومنین کے معیارات میں فرق مقصود نہ ہوتا تو آخر کیا وجہ تھی کہ ایک جگہ تو اللہ تعالی صرف نبی کی بیویوں کو مخاطب کرتا یا نبی سے کہتا کہ اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے اور دوسری جگہ نبی سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور عام عورتوں کو بھی بتادیں؟ اب جو لوگ اس صریح وضاحت کے بعد بھی اس بات پر مصر ہوں کہ گھروں میں بیٹھے رہنے کا حکم صرف ازواج النبی کے لئے نہیں بلکہ اس کا اطلاق تمام مومن عورتوں پر ہوتا ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی مضبوط دلیل لائیں۔

عورت اور عورۃ

جو لوگ عورت کو گھروں میں مقفل کردینے کے قائل ہیں ان کے نزدیک عورت کا پورا وجود "عورۃ" ہے۔ وہ اسے ڈھک چھپا کر رکھنے کی چیز سمجھتے ہیں حتی کہ جسم کے وہ حصے جسے یہ حضرات "عورۃ" نہیں سمجھتے۔ مثلاً چہرہ اور ہتھیلی وہ اسے بھی کھلا رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ ملفوف برقعے کے اندر سے اگر عورت کی آواز سنائی دے گئی تو اس سے بھی ان حضرات کے منہ کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے، متقی

پیشانیاں شکن آلود ہوجاتی ہیں۔ اس رویے کے حاملین کتاب وسنت سے کوئی دلیل لانے کے بجائے صرف اپنے ایجاد کردہ اصول احتیاط کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ انہیں چونکہ عورت کی چلت پھرت میں ہر لمحے فتنے کا خوف محسوس ہوتا ہے اس لئے اس مفروضہ دفع شر کی خاطر یہ مسلم عورت سے اس کا متحرک رول سلب کرلینے میں کچھ تکلف نہیں کرتے۔

عام مومن عورتوں کو تو جانے دیجئے قرآن تو نبی کی بیویوں کو غیر محرموں سے من وراء حجاب بات کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ عہد رسول میں ازواج مطہرات کو علم دین کے اہم ماخذ کی حیثیت حاصل تھی، صحابہ کرام آپ سے احکام دین سنا کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عرصہ تک حضرت عائشہ جیسی غیر معمولی خوبصورت اور ذہین خاتون منصب ارشاد پر فائز رہیں۔ سیدہ عائشہ کے سخت ترین مخالفوں کو بھی اس بات کی جرات نہ ہوئی کہ فتنے کا سہارا لے کر ان کی آواز کو دبا سکتا یا معاشرے میں ان کے غیر معمولی اثرات کو کم کرنے کی کوشش کرتا۔

حضرت عمر نے جب مہر کی ایک خاص حد متعین کرنا چاہی تو مسجد کے ایک گوشے سے ایک عورت نے اس کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی، "اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ کرہی لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیروں مال کیوں نہ دیا ہے اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ وہاں اس بات پر کسی نے اعتراض نہ کیا کہ مردوں کی اسمبلی میں عورت کو اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے کا حق کیسے حاصل ہوگیا؟ بلکہ اس کے برعکس اس عورت کی دلیل مستند مانی گئی اور حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا: "ایک عورت صحیح بات پاگئی اور عمر سے غلطی ہوگئی۔" اسی طرح حضرت ابوبکر اور حضرت فاطمہ کے درمیان جب باغ فدک کے مسئلے پر نزاع اٹھ کھڑا ہوا تو کہا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ نے اپنا حق ثابت کرنے کے لئے باقاعدہ ایک تقریر کی اور اس مسئلہ پر دونوں میں خاصی گرما گرم بحث ہوئی۔

شہادت عثمان کے بعد جب خلافت کے مسئلہ پر پوری مسلم دنیا زبردست اختلافات سے دوچار تھی جس نے صفین اور جمل جیسے باہمی ٹکراؤ کو جنم دیا، فتنے کے اس پورے دور میں بھی عورت کی آواز کو دبانے کے لئے کسی قانون احتیاط کی روایت نہیں ملتی۔ حالانکہ عورت کا وجود سیاسی نظام پر مسلسل اثر انداز ہورہا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ جنگ جمل کی کمان تو کلی طور پر سیدہ عائشہ کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن فتنے کے اس سنگین دور میں بھی حضرت عائشہ کے بیرون خانہ رول پر کسی صحابی کو اعتراض نہ ہوا۔ ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہورہا تھا کہ ایک طرف سیدہ عائشہ ہیں تو دوسری طرف حضرت علی ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دیا جائے۔ حضرت عائشہ کا عورت ہونا ان کے سیاسی سماجی رول سے معزولی کے لئے اگر کافی ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں صحابہ کرام ان کے ساتھ ہوتے۔ اگر عورت کی آواز کو سماجی سیاسی اداروں سے باہر رکھنے کے لئے اسلامی شریعت میں کوئی دلیل مل سکتی تو خواتین اہل بیت کو یزید کے دربار میں خطابت کا جوہر دکھانے کا شاید موقع نہ ملتا۔ جہاں ایک ایک جملے سے وقت کے سیاسی نظام پر کاری ضرب پڑتی تھی اور جو نظام ہر جابرانہ طریقے سے اپنے مخالفین کا راستہ روک سکتا تھا اسے بھی فتنے کے بہانے سے خواتین اہل بیت کو خاموش کرنے کی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔ جب اللہ اور اس کا رسول فتنے کے خوف سے عورت کی آواز پر روک نہیں لگاتا تو ہمیں اس بات کا حق کیسے حاصل ہوگیا کہ عورت کی آواز کو غیر محرموں کے لئے ناجائز یا مکروہ بتائیں۔ کتاب وسنت کی کھلی ہدایت کے باوجود اگر کوئی شخص عورت کی آواز کو فتنہ کے خوف سے حرام قرار دیتا ہو اور کہتا ہو کہ احناف کے نزدیک ایسا ہی معروف ہے یا بعض شافعی علما کو اس بات پر اصرار ہو کہ عورت کی آواز اجنبی مردوں کے سامنے قابل ستر ہے خواہ فتنے کا خوف ہو یا نہ ہو تو اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ تخذوہ ارباب من دون اللہ۔ اس رویے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔



للرجال علیهن درجة

اسلام کی آمد سے معاشرے کے جن طبقات کو خصوصیت سے فائدہ پہونچا ان میں غلام اور عورتیں سر فہرست ہیں۔ ان دونوں کو مکمل انسان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا، قدروں کے نئے میزانیے میں مراتب کی درجہ بندی کا معیار تقوی قرار پایا اس بات کی اہمیت جاتی رہی کہ کوئی شخص غلام ہے یا آقا مرد ہے یا عورت۔ غلام کو آزاد کرنا عمل صالح قرار پایا اور جس کسی کو دو یا تین بچیوں کی پرورش کا موقع مل گیا اسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی۔ غلام اور عورت دونوں طبقوں نے اسلام میں اپنی آزادی کا وافر سامان پایا۔ سماجی روحانی انقلاب مدینہ میں ہر لمحے موجزن تھا۔ کل تک جن بچیوں کی پیدائش باعث تنگ و عار سمجھی جاتی تھی آج وہ رسول کے مقدس مشن میں برابر کی شریک و سہیم نظر آتی تھیں۔ نئے انقلاب نے عورت کو پہلی بار صاحب الرائے اور صاحب عقل تسلیم کیا تھا اور اس کے مشوروں کو مومن مردوں کی طرح لائق عمل گردانا تھا۔ بلکہ رسول کے بعض عمل سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا تھا کہ مفید قابل عمل مشورے دینے میں عورت مرد پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ حدیبیہ کے میدان میں جب اسلامی لشکر نے رسول کے احکام بجالانے میں پس و پیش کا مظاہرہ کیا، جب آپ کے قریبی رفقاء نے بھی سمع وطاعت کی اس ڈسپلن کا ثبوت نہ دیا جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنی بیوی ام سلمی کے خیمے میں داخل ہوئے۔ آپ صورت حال سے

سخت کبیدہ خاطر تھے اور آپ کو اس بات کا بے حد ملال تھا کہ آپ کے اصحاب آپ کا حکم بجالانے میں پس و پیش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بحران کی سنگین لمحے میں حضرت ام سلمیٰ نے جو مشورہ دیا اس نے اس بحرانی کیفیت کو حل کر دیا۔ ایک عورت کے صائب مشورے کا یہ ایک ایسا اظہار تھا جس نے آنے والے دنوں میں اس بحث کو ختم کر دیا کہ بات کہنے والا مرد ہے یا عورت۔ بعد کے عہد میں جب رفتہ رفتہ مسلم معاشرے میں اسلامی انقلابی ایجنڈے پر زور کم ہوتا گیا اور امت کی اخلاقی حالت پہلے جیسی نہ رہی تو احتیاط اور تحفظ کی نفسیات نے خوب خوب کام کیا۔ سیاسی اقتدار چونکہ منہج نبوت سے ہٹ کر ملوکیت کی راہ پر چل نکلا تھا اس لئے اسلام کی بہی خواہی کا یہی راستہ نظر آیا کہ سماجی اور علمی و روحانی سطح پر جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس کی حفاظت کی جائے۔ امت میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو اس نظام جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر امام حسین کی شہادت اور مسلمانوں کے مابین خوں ریز جنگوں سے بھی بہت سے لوگ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ امت کی فلاح اسی میں ہے کہ خون خرابے کا راستہ ترک کرکے اسلامی معاشرے کی غیر سیاسی سطح پر خدمت کی جائے۔ بعد کے ایام میں امام زین العابدین کی شہادت اور عمر بن عبدالعزیز کی پراسرار موت سے بھی اس رویے کے حاملین کا اثر بڑھتا گیا۔ آنے والے دنوں میں تحفظ کی اس نفسیات نے ان میدانوں سے عورت کو بے دخل کرنے کی کوشش کی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جگہ دی تھی۔ مسلم معاشرے کی اخلاقی حالت اگر روبہ زوال تھی تو ضرورت تو اس بات کی تھی کہ اس زوال کے بنیادی ماخذ پر چوٹ کی جاتی، معاشرے کو دوبارہ منہج نبوت پر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن ہوا یہ کہ احتیاط کی منطق کو کام میں لاتے ہوئے خواتین کو سماجی منظر سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ان کی عدم موجودگی سے فتنے کا امکان جاتا رہے۔ اس قبیل کی ایک دلچسپ مثال کعبہ کے طواف سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ کے گورنر محمد بن ہشام نے جب یہ محسوس کیا طواف کے دوران مردوزن کے مخلوط طواف میں فتنہ کا وافر سامان موجود ہے تو اس نے طواف کے دوران عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے بعض ترمیمات کا ارادہ کیا لیکن اس وقت ایک معروف محدث عطا نے اس کی یہ اسکیم کامیاب نہ ہونے دی۔ عطا کی دلیل تھی کہ جب رسول کی بیویوں نے کعبہ کے مخلوط طواف میں حصہ لیا ہے تو تم ان عورتوں کو مردوں کے ساتھ طواف میں شامل ہونے سے کیسے روک سکتے ہو؟

آج اگر بعض لوگ مسلم خاتون کو اہم سماجی اور سیاسی رول دینے سے گریزاں ہیں تو اس کی وجہ فتنے کا خوف نہیں کہ ایک غیر مسلم معاشرے میں تو فتنہ کا وافر سامان پہلے ہی سے موجود ہے۔ ان حضرات کو اس بات کا بھی خوب احساس ہے کہ یہ فتنہ ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں، انٹرنیٹ کے راستے اور ذرائع ابلاغ کے مختلف بہانوں سے اب ہمارے ڈرائنگ روم میں گھس آیا ہے۔ البتہ مسلم خاتون کو ایک سماجی رول دینے میں جو چیز مانع ہے وہ دراصل بعض مروجہ تصورات اور تحفظات ہیں جو عورت کے حوالے سے ان حضرات کے ذہن میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہیں۔ یہ خیال عام ہے کہ عورت ذہنی اور فکری سطح پر مرد کے مقابلے میں کمتر ہے اس لئے اسے بعض اسٹریٹجک نوعیت کی ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی اور نہ ہی نازک امور کو اس پر چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ ناقص العقل ہے۔ اس خیال کے مطابق مردوں کو تو ہر حال میں عورتوں پر برتری اور فوقیت حاصل ہے کہ للرجال علیھن درجہ۔ مرد کی برتری ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیت کے اس ٹکڑے کا اسی بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جس طرح دنیا کی تمام عورتوں کو ذلیل کرنے کے لئے بعض انتہا پسند حضرات ان کیدکن عظیم کا تیر چلا دیتے ہیں۔ حالانکہ مؤخرالذکر کا سیاق و سباق عزیز مصر کی بدکار عورت کا واقعہ ہے۔ آئیے سب سے پہلے للرجال علیھن درجہ کو پورے سیاق و سباق میں دیکھا جائے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ پوری آیت ملاحظہ کیجئے۔

> آپ اب اس اسلام کے علمبردار نہیں رہے جس میں عورتوں کو اتنا کچھ مل گیا تھا کہ صحابہ کرام کو احساس ہونے لگا تھا کہ اسلام آنے کے بعد عورتیں ان کے کنٹرول سے گویا نکل گئی ہیں۔

طلاق یافتہ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے معاملے میں تین مدت ماہواری تک انتظار کریں اور ان کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے ارحام میں پیدا کردی ہیں کہ اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے مردوں کو اس بات کا کہیں بہتر حق حاصل ہے کہ وہ انہیں اس مدت میں واپس لے لیں بشرطیکہ ارادہ اصلاح احوال کا ہو۔ اور عورتوں کو ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں پر عورتوں کے ہیں، البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔ (البقرہ ۲۲۸)

یقیناً مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے مگر کس معاملے میں؟ جو شخص بھی کھلے ذہن سے اس آیت کا مطالعہ کرے گا اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ مرد و عورت کے تعلقات میں قدرت نے جو پیچیدگیاں رکھی ہیں اس میں اگر اچانک انقطاع کی صورت پیدا ہوجائے تو مرد کے مقابلے میں عورت کے لئے یہ مرحلہ زیادہ سخت ہے۔ مرد فوری طور پر دوسری شادی کے لئے سوچ سکتا ہے لیکن عورت کے لئے تین مدت ماہواری تک انتظار کرنا لازم ہوگا۔ اسی اثناء مردوں کو اس بات کا بہتر حق دیا گیا کہ وہ اگر اصلاح احوال کی گنجائش سمجھتے ہوں تو اس امکان سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ گوکہ حقوق دونوں کے ایک دوسرے پر یکساں ہیں۔ اور اس معاملے میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی گئی ہے البتہ طلاق کے مسئلہ کو آغاز سے انجام تک پہونچانے میں مرد کے بنیادی رول کو تسلیم کیا گیا ہے۔ زن و شوہر کی علیحدگی کے لئے شریعت نے جو اصول وضع کئے ہیں اس میں طلاق کے بنیادی محرک کی حیثیت سے مرد کو بہر حال عورت پر ایک درجہ حاصل ہے مرد اپنے طور پر طلاق کا اختیار استعمال

کرسکتا ہے جبکہ عورت کو علیحدگی کے لئے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ آیت مذکور میں اسی "درجہ" کی طرف اشارہ ہے۔

اب اگر کوئی شخص اس ٹکرے کو سیاق و سباق سے ہٹاکر یہ عمومی اصول وضع کرتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے یا کسی کو اس بات پر اصرار ہو کہ دنیا کے سارے مردوں کو دنیا کی ساری عورتوں پر فوقیت حاصل ہے تو وہ دراصل کتاب اللہ کے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ قرآن کا یہ مزاج نہیں کہ کسی قوم، گروہ یا جنس کو عمومیت کے ساتھ بہتر یا کمتر بتائے۔ یہاں تو سارا زور انفرادی عمل پر ہے۔ "الرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن"۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مردوں کو عمومی طور پر عورتوں پر تفوق حاصل ہے ان سے کوئی یہ پوچھے کہ موجودہ دنیا کے بڑے بڑے تقوی زدگان بھی کیا آسیہ اور مریم کی برابری کا دعوی کرسکتے ہیں؟ خود صحابہ کرام کے دور میں جب حضرت علی اور حضرت عائشہ کی فوجیں آمنے سامنے تھیں کسی کو یہ کہنے کی جرآت نہ ہوئی کہ جنسی بنیادوں پر حضرت علی کو حضرت عائشہ پر فوقیت حاصل ہے۔

اگر محض کسی کا عورت ہونا اس کے روحانی یا سماجی نقص کے لئے کافی ہوتا تو یہ کیسے ممکن ہوتا کہ مومن مردوں کے لئے اصحاب فضلیت مومن عورتوں کو نمونہ اور قدوہ کے طور پر پیش کیا جاتا۔

اہل ایمان کے سامنے اللہ فرعون کی بیوی کو مثال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یاد کرو جب اس نے کہا، اے خدا! میرے لئے جنت میں اپنے قریب ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کی حرکتوں سے نجات دے اور مجھے نجات دے ظالموں کی قوم سے۔

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عفت کی حفاظت کی اور ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور جس نے اپنے رب کے کلمات اور وحی کی تصدیق کی اور جو فرماں بردار بندیوں میں ایک تھی۔ (تحریم ۱۲-۱۱)

اللہ کی ان نیک بندیوں کو تمام مومنین کے لئے لائق اتباع مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اصل عبارت میں "**للذین آمنو**" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں اس لئے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ان آیات کی مخاطب صرف مومن عورتیں ہیں۔ ان تمام مردوں اور عورتوں سے جو ایمان لائے قرآن کا مطالبہ ہے کہ وہ اگر اعلی ایمانی مدارج کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہیں بھی اپنے رب کی قربت میں جنت میں ایک گھر کی خواہش ہو تو آسیہ اور مریم کا راستہ اختیار کریں۔ اب اگر کسی کا مرد ہونا اس کے تفوق کے لئے کافی ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ اسے قرب الہی کے حصول کے لئے پاکباز عورتوں کے راستے پر چلنے کی دعوت دی جاتی؟

(سورہ نساء ۳۲)

وخلق منها زوجها

بعض حلقوں میں عورت کی تخلیق کے تعلق سے ایسے تصورات پائے جاتے ہیں جو عورت کو مرد سے کم تر درجے کی تخلیق باور کراتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی روایات کے زیر اثر یہ خیال عام ہے کہ عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور جو چیز مرد کے جسم کے ایک حصے کی مرہون منت ہو بھلا اسے برابری کا درجہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر یہ خیال بھی عام ہے کہ عورت ہے بہرحال ناقص اور بعض حلقوں نے کمزور روایتوں کا سہارا لے کر اسے ناقص العقل والدین بھی قرار دے رکھا ہے۔



اگر عورت کی تخلیق میں واقعی کوئی نقص ہے اور وہ مرد سے کمتر درجے کی مخلوق ہے تو یقیناً یہ بات امت کے اجتماعی مفاد میں نہیں کہ ڈھیر سارے مردوں کی موجودگی میں عورت کو کسی اہم تر ذمہ داری پر فائز کیا جائے۔ لیکن کسی مروجہ مفروضے کو جوں کا توں صحیح مان لینے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کتاب و سنت سے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں۔

عورت ہی کیا قدرت کی ہر تخلیق خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اپنی جگہ شاہکار ہے، نقص اور عیب سے پاک ہے۔ جہاں تک انسانوں کا معاملہ ہے تو اسے اللہ نے تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "ہم نے انسان کو بہترین تقویم میں پیدا کیا" (۹۵۰۴) دوسری جگہ اللہ کا حکم ہے: "**فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس عليها**" (۳۰۰۳۰) یعنی پیدائشی طور پر سارے انسان فطرت سلیم کے حامل ہیں۔ عورت کو بہترین تقویم کی صفت سے خارج کردینا یا اس کی تخلیق میں عقل کا نقص بتاکر کسی بھی سطح پر اسے کم تر درجے کی مخلوق ثابت کرنے کی قرآنی اساس کیا ہے؟ آیئے "**وخلق منها زوجها**" والی آیت پر ایک نظر ڈالیں:

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بے شمار مرد و عورت پھیلادئے۔ اللہ سے ڈرو جس کے حوالے سے تم اپنے باہمی حقوق طلب کرتے ہو اور ارحام کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تمہارے اوپر نظر رکھے ہوئے ہے۔ (۴-۱)

قرآن نے پہلے انسانی جوڑے سے متعلق جتنی کم تفصیلات دی ہیں اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تفصیلات قرآنی تصور حیات کے خط و خال وضع کرنے میں کچھ زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ یہاں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ دنیا کے سارے مرد اور عورت ایک ہی نفس یا روح سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی روح سے ان کا جوڑا بھی

پیدا کیا گیا ہے۔ لفظ نفس عربی زبان میں فی نفسہ تو مونث ہے البتہ اس سیاق میں اسے وسیع معنی استعمال کیا گیا ہے اور یہی معاملہ لفظ زوج کا بھی جو ہے تو مذکر مگر وسیع معنوں میں قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ لفظ من میں "سے" "اور میں" دونوں استعمال کی یکساں گنجائش موجود ہے۔ اس آیت کا لبِ لباب یہ ہے کہ دنیا کہ تمام انسانوں کو خواہ مرد ہوں یا عورت ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی تخلیق میں جو روح استعمال ہوئی ہے یا جس گارے سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے وہ ایک ہی ہے۔ حتی کہ جغرافیائی تقسیم بھی ان کے درمیان تفوق کی کوئی دیوار نہیں کھڑی کر سکتی کہ ان سبھوں کا ماخذ و منبع تو وہی ایک نفس ہے۔ تلقین کی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ مرد عورت کے باہمی حقوق کی طلبی میں ارحام کا خیال رکھو۔ اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور ہے اولاً اللہ سے ڈرو اور ثانیاً یہ کہ کار خانہ رحم کی تخلیقی عظمت کو نہ بھول جاؤ۔ دیکھا جائے تو یہ آیت عورت کو مرد کا کمتر حصہ بتانے کے بجائے عورت کی زبردست تخلیقی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اہل ایمان کو اس بارے میں متوجہ کرتی ہے کہ عورت سے اپنے باہمی حقوق کی طلبی میں اس حقیقت کو نہ بھول جانا کہ اس کائنات میں تمہارا داخلہ کسی عورت کی مادرانہ شفقت و محبت کے نتیجے میں ہی ممکن ہوا ہے۔

رہی بائبل کی یہ کہانی کہ عورت مرد کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے تو قرآنی تصور حیات (Quranic Weltanschauung) میں اس جیسے کسی قصے کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن عورت اور مرد کو یکساں اہمیت کا حامل بتاتا ہے زندگی کے کسی بھی گوشے میں وہ عورت کو مرد کا ضمیمہ نہیں گردانتا۔ وہ تو بائبل کی اس کہانی کا بھی انکار کرتا ہے جس میں جنت سے خروج کی ساری ذمہ داری عورت کے سر ڈال دی گئی ہے اور جس سے یہ تاثر عام ہے عورت میں وساوس کا شکار ہوجانے اور گمرہی کو قبول کر لینے کی کوئی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بائبل کے بر خلاف قرآن باغ عدن سے خروج کی ذمہ داری یکساں طور پر آدم اور حوا دونوں پر ڈالتا ہے۔

> پس شیطان نے اسے ورغلایا۔ اے آدم کیا تجھے میں پتہ نہ بتاؤں اس شجرۃ الخلد کا اور ایک ایسی شہنشاہیت کا جسے کبھی زوال نہیں ہو پھر کیا تھا ان دونوں نے اس درخت سے کھالیا۔ پھر ان دونوں کے جسم سے لباس غائب ہوگئے اور وہ دونوں اپنے جسم کو چھپانے کے لئے جنت کے پتوں کو باہم جوڑنے لگے۔ اس طرح آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہی کا شکار ہوگیا۔ (۱۲۰-۱۲۱:۲۰)

الرجال قوامون علی النساء

جو لوگ عورت کو مرد سے کمتر درجے کی مخلوق سمجھتے ہوں وہ یقیناً اس بات کی ضرورت محسوس کریں گے کہ اس ناسمجھ مخلوق کو دنیا و آخرت کی تباہی سے بچانے کے لئے پوری طرح اس کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ان حضرات کے نزدیک عورت کی پسند و ناپسند، اس کی انفرادی آزادی، دنیا و آخرت کے لئے کسی راستے کے انتخاب کا حق یہ سب کچھ مردوں کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے اس رویے کی صحت کے لئے یہ حضرات قرآن کی اس آیت کا سہارا لیتے ہیں:

> مرد عورتوں پر قوام ہیں چونکہ اللہ تعالی نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور چونکہ مرد اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور پاکباز عورتیں فرمابردار ہوتی ہیں جو تنہائی میں ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی اللہ نے حفاظت کے لئے کہا ہے۔ (۳۴:۴)

" بمافضل اللہ بعضھم علی بعض " سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ دراصل ایک طرح کا عمومی بیان Universal Statement ہے جس میں عورتوں کے اوپر مردوں کی برتری کو واضح کیا گیا ہے۔ لیکن اس آیت کا قرآنی ورلڈ ویو میں قدرے باریک بینی سے مطالعہ کرنے پر یہ غلط فہمی خود بخود رفع ہوجاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اس آیت میں مردوں کی قوامیت کا کوئی اجمالی اصول بیان نہیں ہوا ہے۔ آیت کا اگلا ٹکڑا جو دراصل قوامیت کے اسباب بیان کرتا ہے لفظ "قوام" کی اجمالیت کو محدود کردیتا ہے۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں اس لئے کہ اولاً اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ثانیاً اس لئے کہ مرد اپنے مال میں سے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ معاشرے کے بنیادی یونٹ خاندان کی معاشی تنظیم میں مرد کو اگر خاندان کے قوام کی حیثیت حاصل ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالی نے اسے منتظم کے منصب پر فائز کیا ہے اور اسی کے اوپر ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

عورت پر افزائش نسل کی جو عظیم ذمہ داری ڈال دی گئی ہے انصاف کا تقاضہ تھا کہ اسے حصول معاش کی ذمہ داری سے سبکدوش کردیا جاتا۔ اسلامی معاشرے میں نان و نفقے کی تمام تر ذمہ داری مرد پر ڈال کر اسے گھر کے قوام کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ قوام ہونا ایک معاشی ذمہ داری ہے اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ مرد جسمانی، روحانی یا عقلی طور پر عورت سے ممتاز ہے۔ پھر قوام ہونے کے لئے جو بنیادی شرائط عائد کی گئی ہیں اس میں اس ایک کا تعلق تو اس کے مرد ہونے سے ہے جو فضل کے نتیجے میں اسے خود حاصل ہوگیا ہے البتہ دوسری شرط کسبی ہے۔ اگر کسی وجہ سے مرد معاشی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتا ہے تو اس کی قوامیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

جو لوگ اس آیت کو مردوں کی برتری کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں وہ اسی

> ہماری دیندار بہنوں کے تصور میں بھی یہ بات کم آتی ہے کہ امت اسلامیہ کو موجودہ زوال سے نکال لے جانے اور ایک بار پھر اسلام کی مرکزی خلافت کے قیام کی ذمہ داری مردوں کی طرح ان کے اوپر بھی عائد ہوتی ہے۔

رعایت سے "والصٰلحٰت قٰنتٰت" کا ترجمہ "مومن عورتیں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں" کر ڈالتے ہیں۔ حالانکہ یہاں فرمانبرداری سے اللہ کی فرمانبرداری مراد ہے نہ کے شوہروں کی۔ قرآن میں جہاں دوسری جگہوں پر بھی قنتٰت کا لفظ آیا ہے اس کا اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ پھر جو لوگ اس آیت سے مردوں کی برتری مراد لیتے ہیں ان کے نزدیک کیا دنیا کے سارے مرد دنیا کی ساری عورتوں پر قوام ہیں؟ اگر نہیں تو کون کس کے لئے قوام ہے؟ ایک عمومی بیان کے بجائے یہ آیت خاندان کے چھوٹے سے ڈھانچے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ آگے اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ دنیا کے سارے مردوں کو دنیا کی ساری عورتوں پر فضیلت نہیں ہے بلکہ بعض کو بعض پر۔ اس آیت میں مردوں کی فضیلت کی وجہ معاشی بتائی گئی ہے نہ تو یہاں ان کی مضبوط جسمانی ساخت کا کوئی تذکرہ ہے نہ ہی ان کی عقلی یا روحانی برتری کی طرف کوئی اشارہ۔ رہا روحانی یا عقلی سطح پر کسی کو کسی پر فوقیت دینے کا سوال تو یہ لوگوں کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ معاشی طور پر مرد کی برتری ہی خاندان میں اسے ایسے کلیدی منصب پر فائز کر دیتی ہے کہ اس کی رائے گھر میں بڑی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اسی کلیدی مرتبے کو جو مال کمانے کی وجہ سے اسے حاصل ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ "فضل" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا یہ خصوصی مقام جو گھر چلانے والے کی حیثیت سے اسے حاصل ہو گیا ہے صرف معاشی معاملات تک محدود ہے۔ رہا علمی، یا عقلی سطح پر اس کی برتری کا مسئلہ تو اس کا انحصار تمام تر اس کی اپنی کاوش پر ہے۔ اسی طرح عورت کو اپنے شوہر کی اس معاشی برتری کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہئے کہ اللہ نے مرد کو اس ذمہ داری پر فائز کیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ بڑی مشقتوں سے اس کے لئے ضروریات زندگی جٹاتا ہے۔ گھر کے امور چلانے میں اسے بہر حال باس کی حیثیت تو حاصل ہے ہی۔ البتہ قوام کو اس بات کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ وہ عورت سے مکمل اتباع کا مطالبہ کرے یا عورت کی دینی، روحانی اور علمی ترقی اس کے رحم و کرم کی محتاج ہو کر رہ جائے۔ عورت کی انفرادی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے اسے خود اپنی دنیا و آخرت کی فکر کرنی ہے صالح معاشرہ کے قیام کی جو ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے اس کے لئے خدا کے حضور اسے خود جواب دہ ہونا ہے وہاں کوئی "قوام صاحب" اس کی دادرسی کو نہ آئیں گے۔ اس لئے کسی قوام کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ خود بھی غلبہ دین کی جدوجہد سے جان چرائے اور اپنی عورت کو بھی اس مشن میں شرکت سے روک دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لاطاعۃ لمن لم یطع اللہ یعنی جو شخص کا اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کی اطاعت ہر گز نہ کی جائے۔

عورت اور امور مملکت

اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت کی بنیادی شناخت امت کے حوالے سے ہوتی ہے۔ مرد کی طرح عورت بھی انبیائی تحریک کی ایک اہم رکن ہے۔ اسے ہر لمحے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ انقلابی تحریک کا کارواں کس مرحلے میں ہے آگے کیا کچھ ہونا ہے۔ اسلامی نظام عدل کے قیام میں وہ برابر کی ذمہ داری محسوس کرتی ہے۔ اسلامی تحریک کو سیاست کے مرحلے تک لانے میں جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے ان تمام مراحل میں مرد کی طرح عورت بھی پیش پیش ہوتی ہے خواہ وہ مال کی قربانی کا معاملہ ہو یا وطن خیر باد کہنے کا مسئلہ یا اللہ کی راہ میں جان دینے اور لینے کے مراحل، قرآن مسلم عورت سے یکساں قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ جب اسلامی ریاست وجود میں آجائے تو عورت اپنے آپ کو اسلامی تحریک سے کلیتاً کنارہ کش کر لے۔ جس معاشرے کو قائم کرنے میں اس نے اپنی جان و مال کی بازی لگائی ہے اس کے مستقبل سے وہ کس طرح بے فکر ہو سکتی ہے؟



پھر اسلام اگر عورت کو روحانی اور عقلی طور پر مرد سے کمتر نہیں سمجھتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کی پاک بندیوں کو امور مملکت میں عمل دخل سے روک دے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں اہم پالیسی امور میں مسلم خواتین سے مشورہ ضروری سمجھا جاتا تھا اور خلیفہ کے انتخاب میں بھی ان کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ حضرت عمر کے وصال کے بعد جب خلیفہ کے لئے مجوزہ ناموں کی فہرست حضرت عثمان اور حضرت علی کے ناموں پر آکر رک گئی اور ان دو میں سے کسی ایک کے انتخاب کے مسئلے نے نزاکت اختیار کر لی تو عبدالرحمن بن عوف نے کسی نتیجے پر پہونچے کے لئے جن کلیدی اشخاص سے ملاقات کی ان میں عورتیں بھی شامل تھیں (البدایہ والنہایہ) یہاں تک کہ اگر کوئی ایسی صورت حال پیش آگئی کہ کسی مسلم خاتون نے اپنی انفرادی ذمہ داری پر کوئی اسٹریٹجک نوعیت کا فیصلہ لے لیا تو اسلامی ریاست نے اسے بھی معتبر ٹھہرایا۔ ام ہانی بنت ابو طالب سے ایک واقعہ منقول ہے، کہتی ہیں: فتح مکہ کے سال میں رسول کے پاس گئی عرض کیا "اے خدا کے رسول! میری ماں کے بیٹے علی نے ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے جسے میں امان دے چکی ہوں۔ آپ نے فرمایا! اے ام ہانی! ہم نے بھی اسے امان دی جسے تم امان دے چکی ہو" (شیخین)

جنگ جمل میں حضرت عائشہ کی قیادت اور انتہائی نازک حالت میں امور مملکت کو صحیح رخ دینے کی کوشش سے بھی اس امر کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ مسلم خواتین امور مملکت سے لاتعلق نہیں رہ سکتیں۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد واضح طور پر یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اسلامی ریاست کی بنیادیں ہلنے لگی

ہیں۔ ریاست کا نظم و ضبط ٹوٹ چکا تھا، باغیوں کو کھلی چھوٹ مل گئی تھی، افراتفری کا عجب عالم تھا۔ صورت حال اتنی خراب تھی کہ حضرت علی جیسے صاحب عزم نے بھی بددل ہو کر خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر جب فتنے کا زور تھما تو ایسا محسوس ہوا گویا خود خلیفہ وقت باغیوں کے ہاتھوں بے بس ہو گئے ہوں۔ حضرت عائشہ کے سامنے دو راستے تھے یا تو اپنی آنکھوں کے سامنے اسلامی ریاست کے تار و پود کو بکھرتا دیکھیں یا پھر اصلاح احوال کے لئے اٹھ کھڑی ہوں۔ حضرت عائشہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے بڑے پیمانے پر ملک بھر میں اپنے سفیر بھیجے اور مسلمانوں سے عام اپیل کی کہ اصلاح احوال کی اس مہم میں وہ ان کا ساتھ دیں۔ لیکن جنگ جمل نتائج کے اعتبار سے حوصلہ افزاء ثابت نہیں ہوئی، بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہا اور اس کے نتیجے میں متوقع نتائج بھی حاصل نہ ہو سکے۔ جنگ جمل میں حضرت عائشہ کی ناکامی نے بعد کے ایام میں مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ شاید عورت کی قیادت میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تقریباً وہی ذہنیت ہے جو خروج کے سلسلے میں آج جمہور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ دونوں کی وجہ تقریباً وہی ہے یعنی خون خرابے سے بچتے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے اسلام کی خدمت کی جائے۔ قرن اول میں مسلمانوں کی پے درپے کوششوں کے باوجود خلافت کو دوبارہ منہج نبوت پر قائم کرنا ممکن نہ ہوا یہاں تک کہ جب امام حسین اور اہل بیت کی شہادت بھی ملوکیت کے نظام کو اکھاڑ پھینکنے میں ناکام ہو گئی تو عام مسلمانوں میں یہ خیال مقبول ہوتا گیا کہ امت کا مفاد اسی میں ہے کہ خون خرابے سے بچتے ہوئے زندگی کے دوسرے شعبے میں اسلام کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور سلطان جابر سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ رفتہ رفتہ بعد کے دنوں میں اس رویے کو اتنا اعتبار حاصل ہو گیا کہ آج علماء کی ایک بڑی تعداد عملاً اسی رویے پر گامزن ہے۔ حضرت عائشہ کی ناکامی سے بھی عورت کی قیادت کے سلسلے میں اسی طرح کے منفی خیالات کو فروغ ہوا اور بعد کے دنوں میں عورت کی قیادت کے سلسلے میں عام ذہنوں میں حجابات حائل ہو گئے۔ واضح رہے کہ عورت کی قیادت سے متعلق یہ حدیث کہ "وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جس نے عورت کی قیادت قبول کر لی" جنگ جمل میں حضرت عائشہ کی شکست کے بعد روایت کی گئی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جس امت میں خدا اور اس کے رسول کی باتوں کی اتنی اہمیت ہو، کہ رسول کے ایک قول یا قرآن کی ایک آیت پیش کر دینے پر غور و فکر کے سانچے بدل جاتے ہوں، جہاں فیصلہ کن جنگی مراحل میں قرآن کو فضا میں لہرانے اور اس کے حکم بنانے پر جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہو وہاں اگر یہ حدیث جنگ سے پہلے لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی تو حضرت عائشہ کی حمایت میں کوئی ہاتھ اٹھتا خود حضرت عائشہ کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ اس حدیث رسول کی

موجودگی میں لشکر اسلامی کی کمان سنبھالیں۔

جب اسلام جنس، رنگ یا نسل کی بنیاد پر کسی کو کمتر قرار نہیں دیتا، جب اسلام ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم کی پرزور وکالت کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا رسول کسی عاقلہ مومنہ کو منصب قیادت سے صرف اسی لئے معزول کر دے کہ وہ عورت ہے۔ کیا واقعی عورت کی قیادت میں کوئی قوم فلاح نہیں پا سکتی؟ آئیے دیکھیں قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

ملکہ سبا بلقیس کا قصہ بیان کرتے ہوئے قرآن خاص طور پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے وہ ایک خاتون حکمراں تھی۔ لیکن اس عورت کو کہیں بھی اس کی قوم کی ہلاکت کی وجہ نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی عملاً اس قصے میں ایسا ہوا ہے۔ اس کے برعکس ملکہ سبا کی کہانی ان جزئیات کی طرف تفصیل سے اشارہ کرتی ہے کہ کس طرح ایک عورت کی حکمت اور دانائی سے نہ صرف یہ کہ خود اسے ہدایت حاصل ہوئی بلکہ اس کی پوری قوم راہ راست پر آ گئی۔ غیر اللہ کی بندگی سے نکل کر الٰہ واحد کی بندگی میں داخل ہونے کا سہرا قرآن صرف اور صرف اس خاتون حکمراں کے سر باندھتا ہے۔ دیکھئے قبول حق اور فلاح آخرت کے معاملے میں بلقیس کتنی مستعد نظر آتی ہے۔

> جب اسلام جنس، رنگ یا نسل کی بنیاد پر کسی کو کمتر قرار نہیں دیتا، جب اسلام ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم کی پرزور وکالت کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا رسول کسی عاقلہ مومنہ کو منصب قیادت سے صرف اسی لئے معزول کر دے کہ وہ عورت ہے۔

اس نے کہا اے رفقائے کرام مجھے ایک مہربان خط موصول ہوا ہے۔ یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور کچھ اس طرح ہے "اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تم میرے سلسلے میں غرور کا مظاہرہ نہ کرو بلکہ میرے پاس اس طرح آؤ کہ تم مسلمانوں میں سے ہو۔ اس نے کہا! رفقائے کرام مجھے اس بارے میں مشورہ دو۔ میں کسی مسئلہ کو تمہارے مشورے کے بغیر فیصل نہیں کرتی۔ ان لوگوں نے کہا ہم لوگ طاقتور ہیں خونریز جنگ لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں البتہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے سو حکم دیجئے ہمیں کرنا کیا ہے؟ اس نے کہا، بات یہ ہے کہ بادشاہ جب کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اسے روند ڈالتے ہیں اور اس کے باوقار لوگوں کو بے وقار کر دیتے ہیں۔ وہ بالعموم ایسا ہی کرتے ہیں۔ البتہ میں انہیں ہدیہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ہمارا سفیر کیا خبر لاتا ہے۔

پھر وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب وہ پکار اٹھتی ہے۔

اے میرے رب! میں نے اپنی روح پر بہت ظلم کیا اب میں سلیمان کے ہاتھ پر ایمان لاتی ہوں اس اللہ پر جو دونوں عالم کا رب ہے۔ (۳۵-۳۲:۲۷)

اس واقعہ کے بیان میں جو پہلو سب سے نمایاں ہے وہ یہ کہ حضرت سلیمان کے پیغام کی موصولی سے لے کر قبول اسلام تک بلقیس کا رویہ حق کے سچے متلاشی کا رویہ ہے۔ سلیمان کا خط اس کے لئے "کتاب کریم" کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اسے اپنے اقتدار کے نشے میں ٹھکراتی نہیں اور نہ درباریوں کی اس یقین دہانی کو کوئی اہمیت دیتی

ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس مسئلہ کو قوت کے زور پر بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اس کا رویہ تلاش اور جستجو کا ہے۔ اپنے سفیر کو تحائف کے ساتھ بھیج کر یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ سلیمان واقعی نبی ہیں یا یہ سب کچھ محض ہوس ملک گیری کی ایک چال ہے۔ اور جب سلیمان کی نبوت اور الٰہ واحد کا بے پایاں فضل اس پر واضح ہو جاتا ہے تو ایک لمحے کے توقف کے بغیر اپنے ایمان کا اعلان کر دیتی ہے۔ وہ اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتی کہ وطن لوٹ کر اپنے مصاحبین سے مشورہ کرے۔ سورج پرستی سے الٰہ واحد کی بندگی اور گمرہی سے فلاح کا راستہ دریافت کرنے میں وہ تن تنہا سفر کرتی ہے، کسی مصاحب یا رفیق کی حمایت کی اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سفر میں نہ صرف یہ کہ وہ خود کامیاب ہوتی ہے بلکہ پوری قوم کو فلاح سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

گویا کسی قوم کی فلاح کا انحصار اس بات پر نہیں ہے کہ اس کی قیادت مرد کے ہاتھ میں ہے یا اس منصب پر کوئی عورت فائز کر دی گئی ہے۔ بنیادی اوصاف قبول حق کا مادہ، خدا ترسی اور حکمت و دانائی ہے۔ یہ چیزیں کسی عورت میں جمع ہو جائیں تو ملکہ سبا بن جاتی ہے جس کی حکمت اور دانائی آنے والی نسلوں کے لئے مثال بنا دی جاتی ہے اور ان ہی خصوصیات سے اگر کوئی مرد حکمراں خالی ہو جائے تو وہ ابوجہل کی شکل میں اپنی ہٹ دھرمی اور جھوٹے غرور کی ایک ایسی عبرتناک تاریخ چھوڑ جاتا ہے جس سے آنے والی نسلیں سبق لے سکیں۔ وہ خود بھی ہلاک ہوتا ہے بلکہ پوری قوم کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔



عورت اور سماجی زندگی

اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ ہے اس کا وجود ایک مستقل تحریک کی حیثیت رکھتا ہے کیا عورت کیا مرد، کیا بوڑھا کیا بچہ ہر ایک کو یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ زمین کی خلافت کے جس منصب جلیلہ پر اسے فائز کیا گیا ہے اس میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ جس نظام عدل کی تعمیر میں عورت اور مرد دونوں کا یکساں رول ہو اور جس کی حفاظت اور ارتقاء میں دونوں کی یکساں ذمہ داری ہو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے معاشرے کی پبلک لائف سے عورتوں کو خارج کر دیا جائے۔ اسلامی معاشرے میں عورتیں اسی طرح چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح مرد البتہ ان کا یہ چلنا

پھرنا احکام صحابہ کے ان حدود کے تابع ہوتا ہے جو ایک مسلمہ کی حیثیت سے اسلام ان پر عائد کرتا ہے۔ آداب حجاب کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ زندگی کے ہر گوشے میں اپنی بہترین صلاحیت کا اظہار کر سکتی ہے۔ اسلام نے اسے صرف جائیداد رکھنے کی ہی اجازت نہیں دی اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائیداد کی دیکھ ریکھ کرے اور اگر تجارت یا صنعت کے ذریعے اس میں اضافہ کر سکتی ہے تو اسے آزادانہ طور پر اس بات کی اجازت حاصل ہے۔ عہد رسولؐ میں جو خواتین اپنے بہتر تجارتی تجربے کی وجہ سے معروف تھیں ان میں قیلہ ام بنی انمر کا نام سرفہرست ہے۔ عہد رسولؐ میں یہ بات معیوب نہ تھی کہ کوئی عورت خرید و فروخت کے لئے گھر سے باہر جائے۔ ترمذی نے ابو یاسر کے حوالے سے ایک عورت کا واقعہ نقل کیا ہے جو ان سے کچھ خریدنے آئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ نے توشفاء بنت عبداللہ کو بازار کی پالیسی امور کا نگراں تک بنا دیا تھا۔ (الاصابہ) عورت گھر کے باہر مرد کے کام میں کس طرح شریک ہوتی تھی اس سلسلے میں اسماء بنت ابوبکر کا واقعہ بخاری نے قدرے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظ کیجئے اور دیکھئے کہ عہد رسولؐ کی مسلم خاتون معاشرے میں کس طرح چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اسماء اپنے شوہر زبیر کے کاموں میں اپنی شرکت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں، میں اپنے سروں پر پھلوں کی ٹوکری لاد کر لاتی اس زمین سے جو رسولؐ نے زبیر کو دی تھی۔ یہ زمین تقریباً تین فرسک (کوئی تین کیلومیٹر) دور تھی۔ ایک دن جب میں اپنے سر پر بوجھ اٹھائے آرہی تھی راستے میں میری ملاقات رسول اللہ سے ہوئی جن کے ساتھ دوسرے بہت سے انصار تھے۔ رسول اللہ نے مجھے اپنے پیچھے اونٹ پر بیٹھنے کی پیشکش کی لیکن مجھے مردوں کے گروپ میں شریک ہونے سے شرم آئی۔ رسولؐ نے یہ محسوس کیا کہ حیاء مانع ہے لہٰذا انہوں نے میرے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ بعد میں جب میں نے یہ واقعہ زبیر سے بیان کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح انصار کی ایک جمعیت کے ساتھ میری ملاقات رسول اللہ سے ہوئی اور میں کس طرح ان کی پیشکش کو قبول نہ کر سکی یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اونٹ کو جھکا دیا تھا تاکہ ان کے پیچھے بیٹھ سکوں۔ میں نے کہا زبیر دراصل مجھے شرم معلوم ہوئی۔۔۔"

اسلام نہ تو عورت اور مرد کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا قائل ہے اور نہ ہی بے لگام اختلاط (Free Mixing) کی اجازت دیتا ہے یہاں نہ تو عورتوں کو گھروں میں مقفل کر دینے کی کوئی گنجائش اور نہ ہی اس بات کی اجازت کہ اللہ کی

بندیاں رقص و سرود کی محفلوں میں حدود اللہ کی پامالی کریں۔ یہاں گھر کے باہر، عام مجالس میں یا شارع عام پر عورت اور مرد ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اگر کسی پبلک پلیس پر کسی عورت کو پریشان دیکھ کر کوئی مرد اس کی مدد کے لئے آگے بڑھتا ہے تو تمنیوں کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ملاحظہ کیجئے قرآن مجید بنات یعقوب سے حضرت موسیٰ کی ملاقات کو کس طرح بیان کرتا ہے۔

اور جب وہ پہونچے مدائن کے کوئیں کے قریب تو وہاں ان کا سامنا انسانوں کے ایک غول سے ہوا جو اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا تھا اور ان کے قریب ہی انہوں نے دیکھا کہ دو خواتین انتظار کر رہی ہیں (اپنے مویشیوں کے ساتھ) انہوں نے پوچھا آخر بات کیا ہے؟ ان خواتین نے کہا، ہم اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتے جب تک یہ چرواہے فارغ نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ ہمارا باپ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ (۳۲-۲۸)

مسجد جو سماجی زندگی کی شہ رگ ہے اس کا دروازہ اسلام نے عورت پر اسی طرح کھلا رکھا ہے جس طرح مردوں پر۔ گو کہ عورتوں کو نماز با جماعت سے رخصت دی گئی ہے لیکن اگر اس بہانے کوئی اسے مساجد کی سماجی سیاسی زندگی سے بے دخل کرنا چاہے تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم موجود ہے "اللہ کی بندیوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو"۔ امام مسلم نے عبد اللہ بن عمر کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے ایک صاحب زادے نے اس حدیث کے سننے کے باوجود یہ بات کہی کہ از راہ احتیاط میں اپنی عورتوں کو رات کے وقت مسجد میں جانے کی اجازت نہیں دوں گا تو عبد اللہ بن عمر سخت غضب ناک ہو گئے انہوں نے کہا، "میں کہتا ہوں کے اللہ کے رسول نے یہ بات کہی ہے اور پھر بھی تمہاری یہ ہمت کہ تم کہتے ہو کہ میں اجازت نہیں دوں گا"۔ رات ہو یا دن باہر حالات خراب ہوں یا امن قائم ہو اسلامی شریعت عورت کو یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ مسجد میں اپنا عمل دخل برقرار رکھے۔ اسلام جب اپنی مقدس ترین عبادت گاہوں حرم کعبہ اور حرم مسجد نبوی میں عورتوں کا استقبال کرتا ہے۔ جب حج کے عظیم الشان اجتماع میں اللہ کی بندیوں کی شمولیت تسلیم شدہ ہے تو وہ اسے روز مرہ کی ملی سماجی زندگی میں شرکت سے کیسے روک سکتا ہے؟۔ عہد رسول کے معاشرے میں شاید ہی کوئی ایسا سماجی اجتماع (Public Gathering) ہو جہاں عورت نظر نہ آتی ہو۔ عیدین کے موقع پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ وہ عورتیں بھی عید گاہ پہونچیں جو ایام حیض کی وجہ سے نماز ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔" سبھی خواتین بوڑھی، بچی اور حائضہ عید کے اجتماع میں شرکت کے لئے ضرور جائیں اور اسلام کی برکتوں سے لطف اندوز ہوں۔ البتہ حائضہ عورتیں نماز میں شریک نہ ہوں" (بخاری)

مسجد نبوی کی مجالس میں عورت اور مرد مشترکہ طور پر شریک ہوتے تھے۔

احادیث کے قریبی مطالعے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین شرکاء صرف سامع کی حیثیت سے غیر متعلق نہیں بیٹھی رہتیں بلکہ سوال و جواب اور بحث و مباحثے میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کے دوران ایک خاتون نے توصین دوران خطبہ یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ آخر عورتوں کی بڑی تعداد جہنم میں کیوں جائے گی؟ (مسلم) حضرت ابو ہریرہ نے آپ کی ایک مشترکہ علمی مجلس کا واقعہ کچھ اس طرح نقل کیا ہے، "رسول نے ابھی اپنی نماز ختم ہی کی تھی کہ وہ ہم لوگوں کی طرف مڑے اور ہم سبھوں کو بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے فرمایا"، کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اپنی بیوی سے صحبت کرتے وقت تو دروازے بند کر لیتا ہے لیکن جب وہ باہر جاتا ہے تو ہر شخص سے اس کا تذکرہ کرتا ہے کہ اس نے کیسے اور کیسے کیا؟ تمام مرد حاضرین خاموش رہے۔ تب رسول خواتین کی طرف مڑے اور پوچھا کیا تم میں کوئی اپنے جنسی معاملات دوسری عورتوں سے بیان کرتا ہے؟ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک نوجوان عورت گھٹنوں کے بل کھڑی ہوئی اور اپنی گردن رسول کی طرف بڑھائی تاکہ اسے دیکھ لیں اور اس کی بات سنی جائے۔ اس نے کہا، واللہ سبھی مرد آپس میں ان معاملات پر گفتگو کرتے ہیں اور اسی طرح عورتیں بھی۔ رسول نے کہا، تمہیں معلوم ہے تمہارے اس عمل کی مثال کیسی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیطانی جوڑا عین شارع عام پر لوگوں کے سامنے اپنے جنسی خواہشات کی تکمیل کرتا ہو (احمد اور ابو داؤد)

اسلامی معاشرے میں عورتیں اسی طرح چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح مرد البتہ ان کا یہ چلنا پھرنا ان حدود کے تابع ہوتا ہے جو ایک مسلمہ کی حیثیت سے اسلام ان پر عائد کرتا ہے۔

البتہ جب حاضرین کی کثرت کی وجہ سے عورتوں کو آپ کی بات سننے میں دشواری پیش آنے لگی اور بعض ایسے مسائل پر احکام طلب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے تذکرے پر مشترکہ مجالس میں حیا، مانع تھی تو عورتوں کی طرف سے ہی یہ مطالبہ آیا کہ اے اللہ کے رسول "مردوں نے آپ کے گرد گھیرا بندی کر رکھی ہے" اس مطالبے پر آپ نے خواتین کے لئے علیحدہ دن مخصوص کر دیا۔ (بخاری)

عورت اور میدان جنگ

مستحکم اسلامی ریاست میں جب اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا ہو اور اسلامی فوجیں دور دراز کے ملکوں میں اشاعت اسلام میں مصروف ہوں عورت پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے کہ وہ براہ راست عملی جنگ میں حصہ لے۔ جب یہ کام مومن مرد بخوبی انجام دینے کی پوزیشن میں ہوں تو اسے میدان جنگ سے مکمل رخصت ہے البتہ وہ اگر شرکت کرنا چاہے تو یہ اس کا اختیاری فیصلہ ہے۔ رہی ایک ایسی صورت حال کی بات جب اسلام اور مسلمان سخت ترین ذلت سے دوچار ہوں، جب پوری امت پر ضعف کا ایک ایسا دور گذر رہا ہو جو اس کی تاریخ کا بدترین دور ہو اور جب مومن مردوں کی سر توڑ کوششوں کے باوجود عالمی نظام کفر کا الٹ پھینکنا ممکن نہ ہو رہا ہو تو ایسی

سنگین صورت حال میں قرآن مومن مردوں کی طرح عورتوں سے بھی توقع کرتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کریں۔

پس ان کے رب نے ان کی فریاد منظور کرلی، میں تم میں سے کسی کا اجر ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو لہذا جن لوگوں نے میری خاطر وطن چھوڑا اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے۔ یقیناً میں ان کے گناہ معاف کردوں گا اور انہیں ایسی جنت میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ہے اللہ کا انعام اور اللہ بہترین انعام دینے والا ہے (آل عمران ۱۹۵)

قرآن کی اس آیت کا شان نزول ایک ایسی ہی صورت حال ہے جب امت ابھی مستحکم صالح نظام کی طرف پیش قدمی کررہی تھی۔ بدر اور احد کے معرکے امت کے لئے موت و حیات کی حیثیت رکھتے تھے۔ دشمنوں کے مقابلے میں مسلمان افرادی اور حربی ہر دو اعتبار سے کمزور تھے۔ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ امت کے پاس جتنی بھی قوت ہے اسے ایک فیصلے کن جدوجہد میں جھونک دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کے استحکام اور فتح مکہ سے قبل عورتیں جنگی معرکوں میں حصہ لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں البتہ ریاست کے استحکام اور کفر کے سرنگوں ہوجانے کے بعد جنگوں میں ان کی باقاعدہ شرکت کا تذکرہ بہت زیادہ نہیں ملتا۔ عہد رسول کے جنگی معرکوں میں مسلم خواتین بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتیں۔ عام طور پر ان کا رول (Paramilitary Staff) نیم فوجی دستوں کا ہوتا۔ اگر اس دوران کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ مسلم فوج کفار کے مقابلے میں پسپا ہونے لگی ہے تو وہ براہ راست دشمن سے قتال کے لئے بھی میدان میں آجاتیں۔ بخاری نے حضرت انس کے حوالے سے لکھا ہے کہ جنگ احد میں جب مسلم فوج کے قدم اکھڑ گئے تھے میں نے دیکھا کہ عائشہ اور ام سلیم اپنی پیٹھ پر مشکیزہ لاتیں اور مسلمانوں کی پیاس بجھاتیں۔ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد احد کے معرکے کو مستقبل کے لئے کلیدی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس لئے اس کی منصوبہ بندی خاص طور پر کی گئی اور امت کی جو کچھ بھی قوت تھی اس میں جھونک دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگوں کے مقابلے میں احد میں خواتین کی زیادہ سرگرم شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ نصیبہ بنت کعب کی بہادری کا واقعہ مختلف

مورخین نے نقل کیا ہے۔ جو احد کے میدان میں آئی تو اس ارادے سے تھیں کہ ان کا کام زخمیوں کو پانی پلانا ہوگا لیکن جب اسلام کے مستقبل کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی تو انہوں نے راست جنگ میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے دشمنوں پر ہیبت طاری کردی اور دشمن کے فوجیوں کو کاری ضرب پہونچایا۔ پھر جب احد کا معرکہ خطرناک مرحلے میں داخل ہوگیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس دشمنوں کی زد میں آگئی تو اس خطرناک لمحے میں نصیبہ رسول کی مدافعت میں ڈٹی رہیں (طبقات) کہا جاتا ہے رسول نے آپ کی اس غیر معمولی جرات کی بہت تعریف کی۔



احادیث میں بعض خواتین کا نام اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ لشکر اسلامی کی طبی ٹیم میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ لیلی الغفار ان میں سے ایک ہیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی مہموں میں شرکت کا موقع ملتا۔ انہیں زخمیوں کا علاج اور بیماروں کی تیمارداری کا خاص ملکہ حاصل تھا (الاصابہ) بخاری کی روایت کے مطابق ان کے ذمہ بنیادی کام یہ تھا کہ وہ پیاسوں کو پانی پلائیں، زخمیوں کا علاج کریں اور شہداء کی لاشوں کو مدینہ منتقل کریں۔ معرکہ احد کی طبی ٹیم میں حمنۃ بنت جحش کا نام بھی خاصہ نمایاں ہے۔

عہد رسول کی مسلم خواتین خود کو ایک بے بس مخلوق تصور نہیں کرتیں اور نہ یہ سمجھتیں کہ خطرات کے لمحات میں ان کی حفاظت کی کلی ذمہ داری مردوں کے سر ہے۔ بلکہ جب کبھی بھی حالات پر گرفت کمزور ہوتی دکھائی دی اور انہیں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی خطرے میں نظر آئی انہوں نے راست اقدام کا فیصلہ کرلیا۔ جنگ خندق کے موقع پر دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، مقابلے کا میدان خاصا پھیلا ہوا تھا مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ قلعہ بند عورتوں کی نگرانی کے لئے مردوں کی کوئی جمعیت مخصوص کرسکیں۔ اس موقع پر صرف حسان بن ثابت کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ قلعے کے اندر حقیقی صورت حال کا جب تک دشمنوں کو اندازہ نہ تھا قلعہ پر حملے کا امکان نہ تھا۔ دریں اثنا ایک یہودی قلعے کی نچلی دیوار پر چڑھتا ہوا نظر آیا قریب تھا کہ وہ حقیقی صورت حال سے واقف ہوجاتا۔ صفیہ بنت عبدالمطلب نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اس یہودی کا خاتمہ کردیا (الاصابہ) بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ اس کی گردن کاٹ کر

قلعے کے باہر پھینک دی گئی تاکہ دشمن سمجھیں کے قلعے میں خاصے مرد موجود ہیں اور انہیں حملے کی ہمت نہ ہو۔

خواتین کی جنگوں میں شرکت صرف مدافعت تک محدود نہ تھی اور نہ ایسا تھا کہ وہ نیم فوجی دستوں سے آگے سوچنے کا حوصلہ نہ رکھتی تھیں۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب خواتین نے عین مردوں کی طرح جہاد میں راست شرکت کی ہے۔ ام ضحاک بنت مسعود کے بارے میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ انہوں نے خیبر کے جنگی معرکے میں شرکت کی اور آپ نے انہیں مال غنیمت میں اسی طرح حصہ دیا جس طرح کسی مرد کو۔ نصیبہ بنت کعب جن کا تذکرہ ہم معرکہ احد کے حوالے سے اوپر کر چکے ہیں انہوں نے جنگ یمامہ میں حصہ لیا تھا جس میں ان کے بیٹے عبداللہ کو شہادت ملی اور ان کا ایک بازو جاتا رہا۔ (الاصابہ) ام سلیم بنت ملحن کے اس خنجر کا تذکرہ بھی تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے جو وہ حنین کے معرکے میں لئے پھرتی تھیں۔ اور بنت ملحن کی اس بشارت سے کون واقف نہیں جو رسول اللہ نے انہیں دی تھی کہ ہمارے کچھ لوگ اللہ کی خاطر سبز سمندر کی سطحوں پر سفر کریں گے تو ملحن کی اس بیٹی نے خواہش ظاہر کی اے اللہ کے رسول ہمارا نام بھی ان میں شامل ہونے کی دعا کر دیجئے۔ (بخاری) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کے باوجود کے وہ ایک خاتون تھیں، دور دراز کے جنگی معرکوں میں ان کی شرکت کے لئے دعا کر دی۔

احکام حجاب اور اس کے مطالبات

فی زمانہ مسلم خاتون کے لئے ایک متحرک اور سرگرم داعیانہ زندگی جینے میں جو چیز شاید سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ پردے کا مروجہ تصور ہے جس نے مسلم معاشرے کی نصف قوت کو عملاً عضو معطل بنا کر رکھ دیا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسی اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے جس نے عورت کو زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں عمل دخل کی اجازت دی ہے زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں عورت کی شرکت ممنوع قرار دی گئی ہو۔ پھر جو لوگ عورت کو مکمل طور پر مردوں کے معاشرے سے علیحدہ کر دینا چاہتے ہیں یا جو فتنے کے خوف سے اسے گھروں میں مقید کر دینے کے قائل ہیں ان کے پاس کیا دلیل ہے؟ کیا اللہ اور اس کے رسول نے فتنے سے بچنے اور پاکیزہ معاشرے کے قیام کے لئے جو اصول وضع کئے ہیں وہ کافی نہیں؟ پھر آپ کو اپنی ذہنی اپج پر اتنا اصرار کیوں ہے؟ عہد رسول میں مسلم خواتین کی چلت پھرت اور سماجی منظر نامے پر ان کے عمل دخل کا ہم نے جس قدر تذکرہ کیا ہے اس سے اس بات کا تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ملفوف عورت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ عورتیں حجاب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقدس مشن میں پیش پیش رہتیں۔ حجاب کے احکام ان کے لئے نہ تو حصول تعلیم میں رکاوٹ بن رہے تھے، نہ ہی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں ان کی عدم شرکت کا اس سے کوئی اشارہ ملتا تھا۔ البتہ بعد کے عہد میں جب مسلم معاشرے کا بنیادی ہدف عام مسلمانوں کے ذہنوں میں دھندلا ہوتا گیا، جب عام ملی زندگی میں وسائل کی بہتات اور ٹھہراؤ کی سی کیفیت پیدا ہوتی گئی اور جب اسلامی معاشرے کی اخلاقی صورت حال پہلے جیسی نہ رہی تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ فتنے کے تمام متوقع اور ممکنہ دروازوں کو بند کر دیا جائے۔ لیکن ان ساری انسانی احتیاطی تدابیر کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ فتنے جب بھی بند نہ ہوئے، مسلم معاشرے کا اخلاقی زوال جاری رہا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ عہد عباسی تک بیشتر مسلم امراء اور خلفاء کے درباروں میں نازک اندام غیر ملکی لونڈیوں نے حرم پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ مسلم معاشرے کے اس زوال کو روکنے اور حسن پرستی کے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے جن احتیاطی اقدامات کا اعلان کیا گیا ان میں چہرے کا پردہ بھی شامل تھا۔ مصلحین کی نیت صالح تھی کہ وہ بہر صورت اسلامی معاشرے کے زوال کو روکنا چاہتے تھے لیکن یہ ایک غیر فطری کاروائی تھی اس میں اتنا کس بل نہیں تھا کہ وہ حالات کو بہتر رخ پر ڈال سکے۔ ایسا بھی نہیں کہ اصلاح اور اس ترکیب اصلاح کو امت نے کسی اختلاف کے بغیر قبول کر لیا تھا۔ جب آج تک چہرہ اور ہتھیلیوں کے پردے کے سلسلے میں اختلافات برقرار ہیں تو بھلا اس عہد میں اس اصلاحی طریقہ فکر کے مخالفین کیوں کر نہ رہے ہوں گے۔ تاریخ کی مستند کتابوں میں دو انتہائی معروف اور معتبر مسلم خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے چہرے کے پردے کی سختی سے مخالفت کی اور کبھی بھی اپنا چہرہ چھپانے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ یہ دو خواتین تھیں سکینہ بنت الحسین اور عائشہ بنت طلحہ۔ یہ دونوں خواتین غیر معمولی حسن و جمال کی حامل تھیں۔ سکینہ کا تعلق باقاعدہ اہل بیت سے تھا کہ وہ امام حسین کی بیٹی تھیں اور عائشہ بھی کوئی عام خاتون نہ تھیں بلکہ عائشہ بنت صدیق کی بھتیجی تھیں۔ تاریخ کی کتابوں میں سکینہ کا تذکرہ اور ان کے چہرے کے کھلے ہونے کا ذکر تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ سکینہ نے بچپن میں اپنے خاندان پر بیتنے والے حادثے کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس نظام نے ان کے باپ کو صرف اسی لئے قتل کر دیا کہ وہ موجودہ سیاسی انحراف کے مخالف تھے اور دوبارہ اس معاشرے کو منہاج النبوہ پر قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس نظام کی کوئی سطحی اصلاح انہیں گوارہ نہ تھی وہ کھلے چہرے کے ساتھ مسجد جاتیں اور اگر خطیب مسجد نئے نظام کی حمایت کرتے ہوئے ان کے باپ کی مخالفت میں کوئی جملہ کہہ جاتا تو عین دوران خطبہ اس کی خبر لینے سے باز نہ آتیں۔ چہرے کے پردے کی طرف کچھ یہی رویہ عائشہ بنت طلحہ کا بھی تھا۔ (کتاب

تاریخ کی مستند کتابوں میں دو انتہائی معروف اور معتبر مسلم خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے چہرے کے پردے کی سختی سے مخالفت کی اور کبھی بھی اپنا چہرہ چھپانے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ یہ دو خواتین تھیں سکینہ بنت الحسین اور عائشہ بنت طلحہ۔

الافغانی)

مسلم معاشرے کو دوبارہ اس کی اصل بنیادوں پر قائم کرنے اور غلبہ اسلام کی تحریک میں مسلم خواتین سے عملی تعاون کے لئے لازم ہے کہ انہیں معاشرے میں ایک سرگرم داعیانہ زندگی جینے کا وہ حق لوٹا دیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے اسے عطا کیا تھا اور جسے بعد کے مصلحین نے رفع فتنے کی خاطر ان سے سلب کرلیا ہے۔ اس بارے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ حجاب کے سلسلے میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ آپ کے عہد میں صحابیات نے اس پر کس طرح عمل کیا۔ رہی بعد کے عہد میں فقہا کی اپنی اپنی سمجھ تو اسے اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں قرآن ازواج النبی اور عام مومن عورتوں میں فرق کرتا ہے۔ سورہ احزاب میں واضح طور پر نسا النبی کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، کبھی رسول سے یہ کہا گیا ہے کہ اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے اور کبھی رسول سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے (**یاایھاالنبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین**)۔ قرآن ازواج النبی کو عام مومن عورتوں کی سطح سے بہت بلند دیکھنا چاہتا ہے اس لئے ان کے لئے گھر سے نکلنے اور غیر محرموں سے بات چیت کرنے کے انتہائی سخت اصول متعین کرتا ہے۔ ان کے ہر نیک عمل پر دوہرا اجر ہے اور ہر لغزش پر دوہری باز پرس۔ پھر یہ خواتین کوئی اور خواتین نہیں ہیں یہ اہل بیت نبی ہیں اللہ چاہتا ہے کہ اس متبرک اور مقدس فیملی پر کسی معمولی سی آلائش کا بھی کو شائبہ نہ رہے۔ جہاں دوسری خواتین کو طلاق یا شوہر کی موت کی صورت میں دوسری شادی کرنے کی اجازت ہے۔ وہاں امہاۃ المومنین کے لئے اس امر کی سختی سے ممانعت کردی گئی ہے۔ ازواج نبی کی اس غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے ان کے لئے پردے کے احکامات بھی انتہائی سخت ہیں۔ قرآن نہ تو عام عورتوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ازواج النبی کے درجہ پر فائز ہوجائیں اور نہ ہی ایسا کرنے میں ان سے دوہرے اجر کا وعدہ کرتا ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ ازواج النبی پر بعض وہ چیزیں حرام کردیتا جو عام مومن عورتوں کے لئے جائز قرار دی گئی ہیں۔ عام طور پر متشدد مصلحین ان دو قسم کی آیات کو خلط ملط کرکے اپنے مطلب کا نتیجہ برآمد کرلیتے ہیں پھر ضعیف احادیث اور فرضی قصوں کی مدد سے اپنے نقطۂ نظر کو صحیح قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آیت حجاب میں حکم دینے والا واقعی کیا حکم دے رہا ہے:

اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنے اوپر اپنی چادر ڈال لیا کریں۔ یہ بہتر ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں تکلیف نہ پہونچے۔ اور اللہ گناہوں کو معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ (الاحزاب ۵۹)

اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں الا یہ کہ خود ظاہر ہوجائے اور یہ کہ اپنے سینوں کو اپنی اوڑھنی سے ڈھک لیا کریں اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں سوائے شوہر، باپ، خسر، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے (ہم پلہ) عورتیں، غلام یا وہ ماتحت خدمتگار جو عورتوں سے کچھ تعرض نہیں کرتے یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کے شعور سے خالی ہوں۔ اور یہ کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر اس طرح مارتی نہ چلیں کہ کسی کی توجہ ملتفت ہو ان کی پوشیدہ زینت کی طرف۔ (النور ۳۱)



پردے کے سلسلے میں یہی دو آیات ہیں جن میں مومن عورتوں کے لئے گھر کے اندر اور گھر کے باہر حجاب کے حدود متعین کئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ان دونوں آیات کا لب لباب یہ ہے کہ (۱) **یدنین علھین من جلابیبھن** یعنی اپنے اوپر اپنی چادر ڈال لیا کریں (۲) **ویضربن بخمرھن علی جیوبھن** یعنی اپنے سینوں کو اپنی چادر سے ڈھک لیا کرو۔ علماء کا ایک گروہ جو ناسخ و منسوخ کا قائل ہے سورہ نور کی آیت کو آخری حکم کی حیثیت دیتا ہے اس کے خیال میں سورہ نور چونکہ بعد میں نازل ہوئی ہے اس لئے اسے سورہ احزاب کے احکام کی آخری شکل سمجھنا چاہیے۔ البتہ ہم اختلافی طریقہ تحقیق و تفسیر سے بچتے ہوئے آیات کے قریبی مطالعے کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ مجموعی طور پر ان دونوں آیات میں پردے کے حدود کس طرح متعین کئے جارہے ہیں۔ آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اوپر جلباب یعنی چادر ڈال لینے کا مطلب کیا ہے۔

احادیث میں جلباب کا جہاں تذکرہ آیا ہے اس سے ایک ایسی چادر مراد لی گئی ہے جو عورتیں گھروں سے باہر نکلتے وقت استعمال کیا کرتی تھیں۔ شیخان نے ام عطیہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ نے ہم عورتوں کو عیدین کی نماز میں شرکت کا حکم دیا تو اس وقت ہم نے پوچھا یا رسول اللہ ہم میں سے ایک کے پاس جلباب نہیں ہے آپ نے فرمایا کیا وہ اپنی بہن کا جلباب نہیں لے سکتی؟۔

خماراس چھوٹی چادر کو کہتے ہیں جو عام طور پر سر اور سینے کے ڈھکنے کے لئے اندرون خانہ استعمال ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے **لایقبل اللہ صلاۃ الحائض الابخمار** ۔ جلباب اور خمار سے سر اور سینہ تو ڈھکا جاتا ہے چہرہ نہیں اور نہ ہی ان آیات میں چہرہ ڈھکنے کا کوئی حکم دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس آیت سے چہرہ ڈھکنے کا حکم بر آمد کرتے ہیں وہ اپنی سہولت کے لئے **یدنین علیھین من جلا بیبھن** کا ترجمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں، "کہ وہ اپنے اوپر چادر کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ جو شخص عربی زبان کا معمولی سا ذوق بھی رکھتا ہے وہ باسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ کی کھینچ کھانچ ہے یہ ترجمہ زبان کی صحت پر پورا نہیں اترتا۔ عربی زبان میں ادنی کے معنی قریب کرنے کے ہیں چنانچہ راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے ؛ **دانیت بین الامرین ، ادنیت احد ھمامن الآخر**۔ اسی طرح ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل شارع کا مقصد ہے " **تدنی الجلباب الی وجھا ، ولاتفرب بہ** "" کہ وہ جلباب اپنے چہرے کے قریب کرلے لیکن اس اوپر نہ ڈالے " یعنی چہرہ ڈھکے نہیں۔

جہاں تک چہرے کے پردے کا سوال ہے تو یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لئے خاص ہے۔ شیخان نے حضرت انس سے روایت کیا ہے جب خیبر کی جنگ میں صفیہ بنت حیی آئیں تو صحابہ کرام نے آپس میں کہا پتہ نہیں آپ نے ان سے شادی کرلی ہے یا انہیں خادمہ کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں ؟ توان لوگوں نے کہا اگر انہیں پردے میں ڈال دیں تو سمجھو آپ نے شادی کرلی ہے اور اگر پردہ نہ کرائیں تو سمجھو کہ یہ خادمہ ہیں "۔ چہرے کے بارے میں جمہور علماء کی رائے ہے کہ اسے ستر عورت میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی اسی خیال کے حامی ہیں۔ صحیح احادیث میں ہے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں چہرہ ڈھکنے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا ہے۔

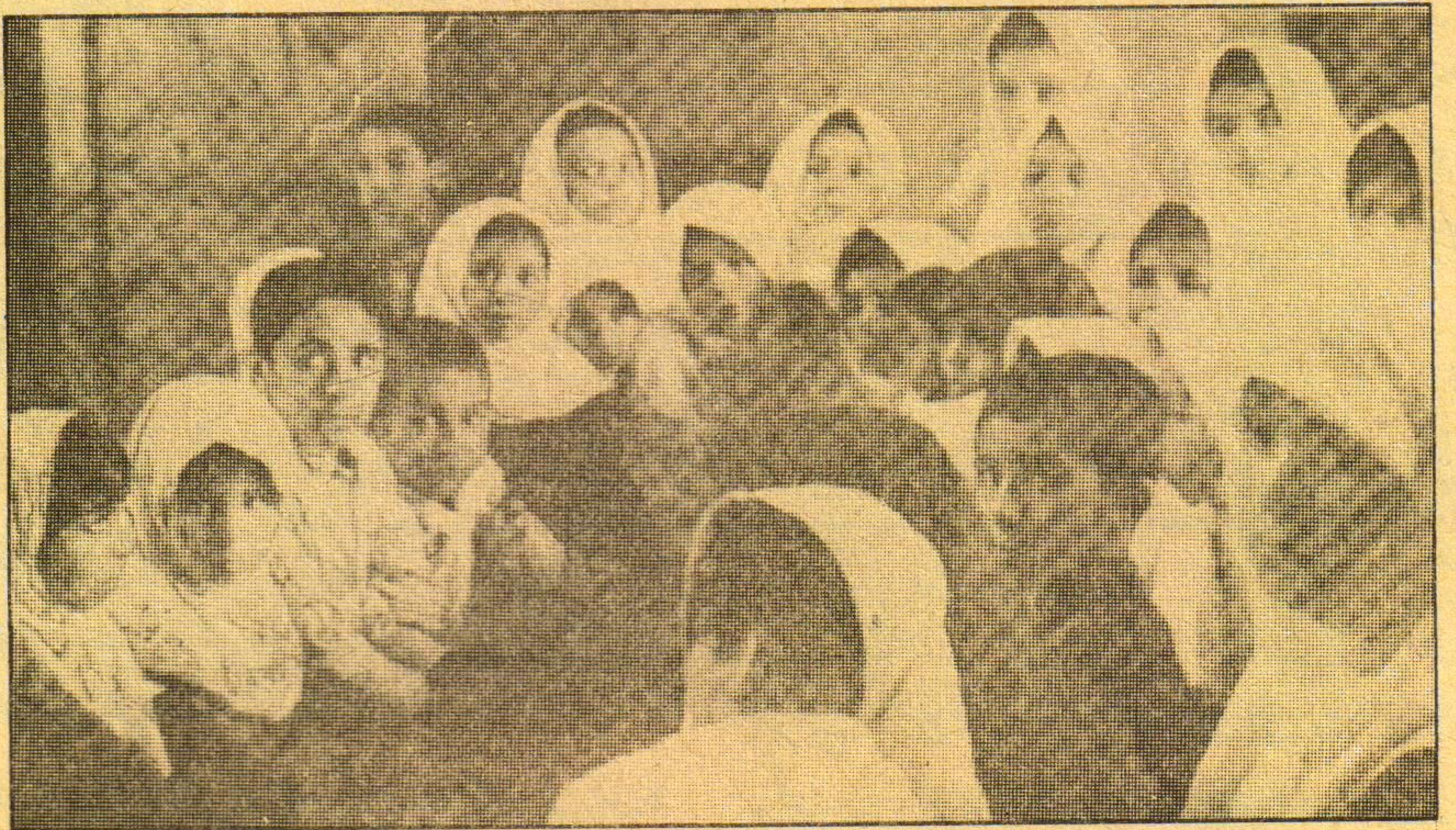
ذالک ادنی ان یعرفن فلایوذین کی جس تفسیر پر چہرے کے پردے کی عمارت کھڑی کی گئی ذرا اس کا بھی حال ملاحظہ کیجئے طبری، حصاص، رازی وغیرہ نے اس آیت کی تشریح میں جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، جاہلیت میں منافقین مومن عورتوں کو پریشان کیا کرتے تھے۔ اس لئے عام لونڈیوں کو آزاد عورتوں سے ممتاز کرنے کے لئے اللہ نے جلباب کے استعمال کا حکم دیا۔ رازی نے اس خیال کو مزید مدلل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اولا اس لباس سے یہ پتہ چل جائے گا کہ وہ اشراف کی عورتیں ہیں اور ان سے تعرض نہ کیا جائے گا ثانیا عام لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ بدکار عورتیں نہیں ہیں کیوں کہ جو عورت چہرہ چھپائے گی جو کہ ستر میں شامل نہیں ہے جس کا چھپانا لازم ہو، تو کوئی شخص اس سے یہ توقع نہیں کرے گا کہ ایسی کوئی عورت بدکاری پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ ابن ابی سبرہ کے حوالے سے ابن کعب القرظی نے نقل کیا ہے۔ اس واقعے میں بعض ایسی تاریخی غلطیاں موجود ہیں جو اس کے ضعف پر دلالت کرتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت ابن کعب القرظی سے آگے نہیں جاتی اور القرظی خود تابعی ہیں۔ گویا یہ حدیث مرسل ہے پھر یہ کہ ابن ابی سبرہ حدیث وضع کرنے میں شہرت رکھتے ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں چہرہ چھپاکر شریف زادیاں ثابت کرنے والے جتنے واقعات بھی نقل کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب مرسل ہیں۔ ان کا اصل صورت حال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ واقعہ اسلام کی اس ثقافت سے بھی ٹکراتا ہے جس میں ایمانی سطح پر غلام اور آقا، آزاد عورتیں اور باندیاں ایک ہی سطح پر رکھی گئی ہیں۔ ورنہ یہ کون سا اسلامی معاشرہ ہوا جہاں شریف زادیوں کو تو چہرہ چھپاکر بدکار مردوں کی زد سے بچانے کا انتظام کرلیا گیا اور لونڈیوں کو بدکاروں کے مشق ستم بننے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اس قبیل کے مفسرین جو اپنے دلائل کے محل اس قسم کی ضعیف روایتوں پر تعمیر کرتے ہیں وہ غیر آزاد مسلم عورت کے بارے میں عجیب و غریب تصورات رکھتے ہیں۔ یہ بوالعجبی آپ بھی ملاحظہ کیجئے، ابوبکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں، کسی غیر محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ لونڈی کے بال دیکھے، بازو دیکھے، سینہ دیکھے اور پستان دیکھے۔ کوئی ان سے یہ پوچھے کہ اس کے بعد بچا ہی کیا۔

> آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عہد میں مسلم خواتین میں چہرے اور ہتھیلیوں کے چھپانے کا رواج نہ تھا، مسلم خواتین اب جاہلیت کے برعکس گھروں سے باہر نکلتے وقت جلباب کا استعمال کرتیں۔ انہیں باہر کے کام کاج کرنے اور خرید وفروخت کی عام اجازت تھی کوئی بھی اہم ملی اور سماجی نوعیت کی مجلس ان سے خالی نہ تھی

اسلام آزاد اور غیر آزاد مومن عورتوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں تو غلام آقا، مرد اور عورت سب برابر ہیں۔ عظمت کا معیار تقوی ہے۔ زنا آزاد عورتوں سے کیا جائے یا غلام عورتوں سے یہ بہر حال زنا ہے، ایک پاکیزہ معاشرہ اس سلسلے میں نرم رویہ نہیں اختیار کر سکتا۔ پھر اگر کسی کے نزدیک جلباب کا استعمال یا چہرے کا پردہ اس لئے ضروری ہے کہ شریف زادیوں کو بدکاروں سے تمیز کیا جاسکے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہئے ہر معاشرے میں شریف زادیوں کی علامتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ قرآن کی آیات کو اصل متن سے دور لے جاکر عجیب و غریب تاویلات میں پھنسانا مناسب نہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ان آیات سے وہی مطلب نکالیں جو سیدھے طور سے متن سے بر آمد ہوتا ہو اور جس کی تصدیق آپ کے عہد میں صحابیات کے عمل سے ہوتی ہو۔ ان آیات میں احکام حجاب کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن عورتوں پر لازم ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے آپ کو جلباب سے ڈھک لیں، البتہ انہیں چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رکھنے کی اجازت ہے تاکہ وہ سہولت سے اپنے سارے کام کاج اسی طرح انجام دے سکیں جیسے عہد نبوی میں انجام دیتی تھیں۔

حضرت عمر کو جس عورت نے مہر کے مسئلہ پر عین خطبے کے دوران ٹوکا تھا

اس کے بارے میں راویوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک چپٹی ناک والی عورت تھی۔ قیس بن ابی حازم سے روایت ہے کہ انہوں نے اسماء بنت عمیس کو ابوبکر کے ہاں دیکھا جو ایک گوری عورت تھی اور جن کے دونوں ہاتھ موشومہ تھے (طبری) ابی السلیل نے حضرت ابوذر کی بیٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے روایت کی ہے کہ جب ان کی بیٹی اپنے باپ سے ملنے آئی تو چند لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے اور السلیل کہتے ہیں کہ ان کی اپنی بیٹی نے اون کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے گال پچکے ہوئے تھے (ابن سعد) حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ میں رسول کے ساتھ بیٹھا کہ فاطمہ آئیں، ہم نے دیکھا کہ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کے لئے دعا کی۔ دعا کے بعد جب میں نے دیکھا تو ان کے چہرے کی بشاشت واپس آگئی تھی۔ (ابن جریر، فی التہذیب) قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ ہم تین لوگ جس میں بنی اسد کی ایک بوڑھی خاتون بھی تھیں ابن مسعود کے ہاں گئے۔ اس خاتون کی پیشانی پر نشانات بنے تھے جس پر انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ابو اسماء الرجبی سے روایت ہے کہ وہ ابوذر غفاری کے ہاں گئے اور دیکھا کہ ان کی ایک بیوی سیافام ہے۔ (احمد و ابن سعد) عروہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن فاطمہ بنت علی بن ابی طالب کے ہاں گیا میں نے ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی دیکھی (ابن سعد) یہ اور اس نوعیت کے واقعات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عہد میں مسلم خواتین میں چہرے اور ہتھیلیوں کے چھپانے کا رواج نہ تھا۔ اسلام نے جس ثقافت کو جنم دیا تھا اس میں پاکیزہ زندگی پر زور تھا، مسلم خواتین اب جاہلیت کے برعکس گھروں سے باہر نکلتے وقت جلباب کا استعمال کرتیں۔ انہیں باہر کے کام کاج کرنے اور خرید و فروخت کی عام اجازت تھی کوئی بھی اہم ملی اور سماجی نوعیت کی مجلس ان سے خالی نہ تھی کہ عہد رسول میں مسلم عورت کا پردہ ان کی اس آزادی کی علامت تھا جو اسلام نے انہیں جاہل معاشرے سے نجات کی شکل میں عطا کیا تھا۔



اسلامی معاشرہ کا حدف

اسلام کا مطالبہ ہے کہ مومن مرد اور عورت ایک صالح معاشرے کے قیام میں بھرپور شرکت کرے۔ وہ مرد کی طرح عورت کو بھی اس مقدس مشن میں شرکت کی مکمل آزادی دیتا ہے البتہ وہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرتا کہ ایک مثالی پرامن اور صالح معاشرے کے قیام کے لئے جو لوگ سرگرم عمل ہیں وہ بذاتِ خود کمزور لوگ ہیں، ان سے بشری تقاضوں کے تحت لغزشیں سرزد ہو سکتی ہیں۔ ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ انسانوں کے آپسی روابط اور مرد و زن کے باہمی تعامل کے لئے بعض بنیادی اصول متعین کر دئے جائیں۔ البتہ اصولوں کے تعین میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کسی فریق کی حق تلفی نہ ہو، مرد اور عورت دونوں پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی کہ وہ کوئی ایسی صورتِ حال نہ پیدا ہونے دیں جہاں شیطان کو دخل اندازی کا موقع ملے۔ غیر محرم عورت اور مرد کے لئے یہ ضابطہ مقرر کر دیا گیا کہ وہ اپنی ملاقات کے دوران کسی تیسرے شخص کو ضرور شامل کرے (شیخین) اس بات کی سختی سے ممانعت کر دی گئی کہ کوئی مرد کسی مرد کو اور عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے (مسلم) ایسے لباس سے بھی منع کر دیا گیا جس کا مقصد جسم کو زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرنا ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اللہ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ مومن مردوں اور عورتوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نگاہوں کی خیانت سے بچیں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں (سورہ نور)۔ مومن عورتوں کو تاکید کی گئی کہ باہر نکلتے وقت اپنے اوپر جلباب ڈال لیا کریں۔ گویا ہر طرح اس بات کی پیش بندی کر دی گئی کہ مرد اور عورت کے سماجی تعامل میں غیر صحت بندانہ جنسی داعیات ان کے اوپر حاوی نہ ہو جائیں۔

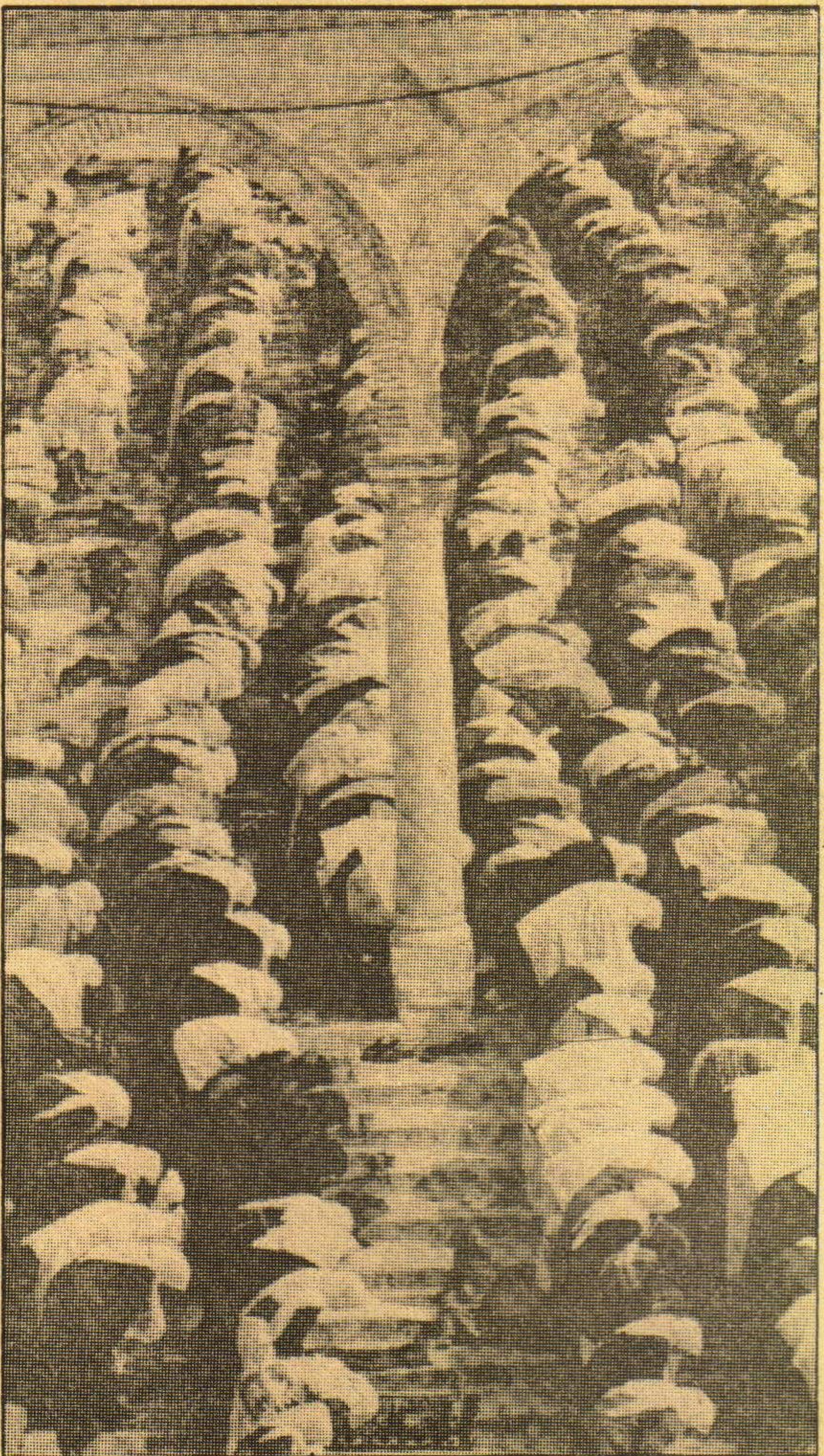
اسلامی معاشرے کا حدف نہ تو کسی خاص قسم کے تصور حجاب کو رواج دینا ہے اور نہ ہی اس کا مقصد مردوں اور عورتوں کو الگ الگ دنیا میں مقید کر دینا چاہتا ہے۔ غیر محرموں کے مابین روابط میں اسلام تو صرف اس احتیاط کی ضمانت چاہتا ہے کہ جو لوگ زمین پر ایک پاکیزہ معاشرے کے قیام کے داعی ہوں وہ کسی بشریات کا شکار ہو کر ضایع نہ ہو جائیں۔ اسلامی احکامات کا مقصد عورتوں کو گھروں میں مقید کرنا نہیں بلکہ جنسی داعیات سے پاک ایک معاشرہ تعمیر کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ مسجد جاتی ہوئی کسی عورت سے بھی فتنے کے فروغ کا امکان ہو تو اسے روک دیا جاتا ہے آپ نے عورتوں کو معطر ہو کر مسجدوں میں جانے سے اسی لئے منع فرمایا ہے۔ رہی سماجی زندگی میں عورتوں کی چلت پھرت یا غیر محرم مومن مردوں کے مومن عورتوں سے سماجی رابطے میں آنے کا مسئلہ تو اسلام کو اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ وہ ایک ہی مشن کے لئے کام کرنے والے مومن مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا رفیق گردانتا ہے۔ **والمومنین والمومنات بعضھم اولیاء بعض**۔ مدائین کے کوئیں پر حضرت موسی کی دو، دوشیزاؤں سے ملاقات اور ان کی گفتگو سے بھی اسی امر کا

اشارہ ملتا ہے کہ پبلک مقامات پر غیر محرم عورتوں سے گفتگو اور ان کی مدد اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ نہیں ہے بلکہ صحت مند رشتوں کو جنم دینے کا باعث ہوسکتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ عام پبلک مقامات پر سلام کا تبادلہ کریں، ایک دوسرے کی خیریت دریافت کریں۔ سلام کے تبادلے میں مرد و عورت محرم اور غیر محرم شناسا یا اجنبی کی قید نہیں رکھی گئی ہے۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں بیٹھی عورتوں کو سلام کیا اور اشارۃ اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔

صالح معاشرے کے قیام کے لئے اسلام افراد کی ذہنی اور روحانی تربیت پر زور دیتا ہے اور انہیں بعض بنیادی رہنما اصولوں پر سختی سے گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایک ایسی معاشرت کا طالب ہے جس میں عورتوں کی چلت پھرت کے باوجود تقوی کے مظاہر مدہم نہ پڑتے ہوں۔ وہ کسی ایسے مصنوعی حل کا قائل نہیں جس میں فتنے کے خوف سے عورتوں کو ملفوف اور مقید کردیا جائے۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ فتنہ یا جنسی تحریک ہر فرد میں مختلف سطح پر ظہور پذیر ہوتی ہے اس لئے کسی خاص اظہار کو فتنے کا سبب قرار دے کر مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ عورت کو سماجی زندگی سے بے دخل کرنے کے بجائے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کی تربیت کی جائے۔ عہد رسول کے معاشرے میں اسی اسپرٹ کا عمل دخل دکھائی دیتا ہے۔

صالح معاشرے کے قیام میں خواتین کی ذمہ داریاں

ایک ایسے عہد میں جب اسلامی نظام کا شیرازہ منتشر ہو، اسلام کے سماجی اور سیاسی ادارے ٹوٹ پھوٹ چکے ہوں، اور پوری امت ایک غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی جینے پر مجبور ہو، ضعف کے ایک ایسے مرحلے میں اگر کوئی شخص مسلم خواتین کو مفروضہ فتنے کے ڈر سے گھروں میں مقفل کردینا چاہتا ہو تو یقیناً اس کی عقل پر ماتم کرنا چاہئے۔ بھلا اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہو گا کہ آپ کی پوری زندگی ایک غیر اسلامی نظام کی آلائشوں میں لت پت ہے۔ آپ شب و روز اٹھتے بیٹھتے اللہ کے احکامات کی نافرمانی کرنے پر مجبور ہیں، آپ کی زندگی باطل کے احکام و خرامن کی تابع ہے۔ مدت سے ایک ایسی غلیظ صورت حال میں رہتے ہوئے اب یہ سب کچھ آپ کو معمول کی زندگی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اس بات کو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ آپ کے لئے زندگی بسر کرنے کا صرف وہی طریقہ فتح کی ضمانت دیتا ہے جو اللہ کے رسول کے توسط سے آپ تک پہونچا ہے۔ بھلا اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہوگا کہ آپ بنیادی انبیائی ایجنڈے سے غفلت کی زندگی گذار رہے ہیں اللہ کی راہ میں قربانیاں دینے اور اس کے دین کے غلبہ کے لئے شہادت کا خیال بھی اب آپ کو کم ہی آتا ہے۔ گویا اسلام کا واقعی تصور آپ کے دل و دماغ سے رخصت ہوچکا ہے۔ جب آپ کی پوری زندگی اتنے بڑے فتنے کے درمیان بسر ہورہی ہے اور آپ کے ایمان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تو اس کے مقابلے میں ایک بہت چھوٹے سے فتنے سے آپ کے اوسان کیوں خطا ہو جاتے ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ مچھر چھاننے اور اونٹ نگلنے کے بجائے اس بڑے فتنے کے مقابلے کے لئے تیار ہوجائیں ورنہ ہمارا بچا کھچا ایمانی سرمایہ بھی اس نظام غلیظ کے زیر سایہ تباہ ہوجائے گا۔



آج مسلم معاشرہ اور اس کی خواتین اگر اپنے اندرون میں کوئی بے چینی محسوس کرتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ انہیں اللہ اور اسکے رسول کے راستے سے کوئی اختلاف ہوگیا ہے بلکہ اس بے چینی کی وجہ ہماری یہ آلودہ ثقافت ہے جس نے ان سے ایک سرگرم مومنہ کا رول سلب کرلیا ہے۔ انہیں اس بات پر قلق ہے کہ فتنے کے بہانے نے مسلم معاشرے نے اللہ کی راہ میں ان کی سرگرمیوں پر روک لگا دی ہے۔ انہیں اس بات کا بھی شدید دکھ ہے کہ عرصے سے ان کے دینی بھائیوں نے ایک غیر اسلامی نظام کو قبول کر رکھا ہے وہ نہ تو خود ایک صالح نظام کے قیام میں کوئی موثر رول ادا کررہے ہیں اور نہ ہی اپنی بہنوں کو اس سعادت میں شریک کرنے کے قائل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مروجہ مسلم رویے سے تنگ آکر بعض بہنوں نے اب مغرب کی تحریکوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنا شروع کردیا ہے۔ جو آزادی کے نام پر ان کا سب کچھ چھین لینے کے درپے ہیں۔ ایک ایسی صورت حال میں جب خوفناک تبدیلیاں ہمارے دروں پر دستک دے رہی ہیں باشعور مسلم بہنوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں مسلم بہنوں کے لئے ایک منشور حیات مرتب کریں۔ گویا اب وہ لمحہ آپہونچا ہے کہ مسلم خواتین کو وہ سرگرم داعیانہ رول لوٹا دیا جائے۔ جو عہد رسول میں اسے حاصل تھا۔ ▭

جاپان میں اسلام خواتین کے دلوں پر دستک دے رہا ہے

لینی ناناکوکے قلم سے تازہ ترین صورت حال پر ایک تبصرہ

جاپان میں رفتہ رفتہ اسلام بحث کا موضوع بنتا جارہا ہے۔ گزشتہ دنوں خواتین میں قبول اسلام کے واقعات نے خاص طور پر دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی ہے۔ ان ہی خواتین میں ایک عائشہ عابد ہیں جنہوں نے آج سے چار سال پہلے اسلام قبول کیا اور اس کے دو سال بعد پاکستان کے ایک شخص کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ جاپان میں مسلمانوں سے شادی کرنے والی عورتوں کی طرح عائشہ بھی اسلامی شعائر کی پابندی سے بے نیاز سی رہیں لیکن ایک دن کیا ہوا کہ مارے شوق میں پہلی بار انہوں نے سجدہ کیا۔ ان کے مسلمان شوہر نے ان پر اسلام لانے کے لئے کبھی زور نہیں ڈالا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس پورے عرصے میں عائشہ کو اس طرف توجہ دلاتے رہے تھے۔ عائشہ کو سجدہ کرتے دیکھ کر ان کی آنکھ میں آنسو آگئے۔

جاپان میں غیر معروف ہونے کے باوجود نوجوان جاپانی عورتوں تک اسلام مختلف راستوں سے پہنچا ہے۔ خصوصاً جنہوں نے بنگلہ دیش، پاکستان، ملیشیا اور ایران جیسے مسلم ممالک سے ملازمت کے سلسلے میں جاپان میں مقیم مسلم مردوں سے شادی کی ہے۔

سال رواں میں اسلامی مرکز نے اسی نو مسلموں کے نام درج رجسٹر کئے ہیں جن میں سے اکثریت جاپانی عورتوں کی ہے۔ ان میں سے چالیس عورتوں نے غیر ملکی مسلمان مردوں سے شادی کی ہے یعنی کہ ایسے اشخاص بھی ہیں جنہوں نے شادی کے مقصد کے بغیر بھی اسلام قبول کیا ہے۔ اسلامی مرکز کے ڈائرکٹر کے قول کے مطابق جاپانی خواتین کے اسلام کی طرف میلان کا سبب یہ ہے کہ وہ آزادی کی طلبگار ہیں اور وہ آزادی انہیں اسلام عطا کرتا ہے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں عورت کی حیثیت غلام کی نہیں ہے۔ اسلام عورت پر ظلم وجبر اور اس کے ساتھ اخلاق سوز افعال کی ہرگز حمایت نہیں کرتا بلکہ عورتوں کو مکمل احترام و تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی طرح اسلام کو غیر شرعی ارتباط و اختلاط بھی گوارا نہیں ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو ان خواتین کے لئے کشش کا باعث ہیں۔



مسلمان مردوں سے شادی کرنے والی جاپانی عورتوں سے ان کے گھر والے لاتعلق ہوجاتے ہیں اور اپنے حلقہ احباب سے بھی کٹ کر رہ جاتی ہیں۔ سب کچھ وہ برداشت کرتی ہیں کیونکہ اسلام ان کی زندگی کا کایا پلٹ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر پانچ اوقات کی نماز کے معاملے کو ہی لیجئے۔ ملازمت پیشہ عورت کے لئے یہ کام خاصا مشکل ہے۔ لیکن کسی الیکٹرونک کمپنی میں ملازم جاپانی مسلم دوشیزہ نماز پڑھنے کا انتظام کپڑے بدلنے کے لئے مخصوص کمرے میں کرلیتی ہے۔ اسلام چونکہ شراب اور خنزیر کی آمیزش والی اشیاء کے استعمال کو حرام قرار دیتا ہے اور شرعی طریقے کے علاوہ دیگر طریقوں سے ذبح کئے گئے جانور کا گوشت کھانے سے منع کرتا ہے۔ یہ تعلیم ان خواتین کو سوپر مارکیٹوں کے چکر کاٹنے کی زحمت سے نجات دلادیتی ہے۔ حالانکہ ایسی دوکانوں کی کمی نہیں ہے جہاں پر حرام اشیاء سے پاک غذائیں مل سکتی ہیں ایک جاپانی مسلم عورت نے بیان کیا کہ ہم بازار میں بکنے والے کھانے کے بجائے مچھلی، پھلوں کے عرق اور اپنے ہاتھ کی بنی مٹھائیوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ مسلمان عورت کی واضح شناخت حجاب ہے جو اس کے بال کھنیوں اور ہاتھوں کو ڈھکے رہتا ہے۔ حجاب

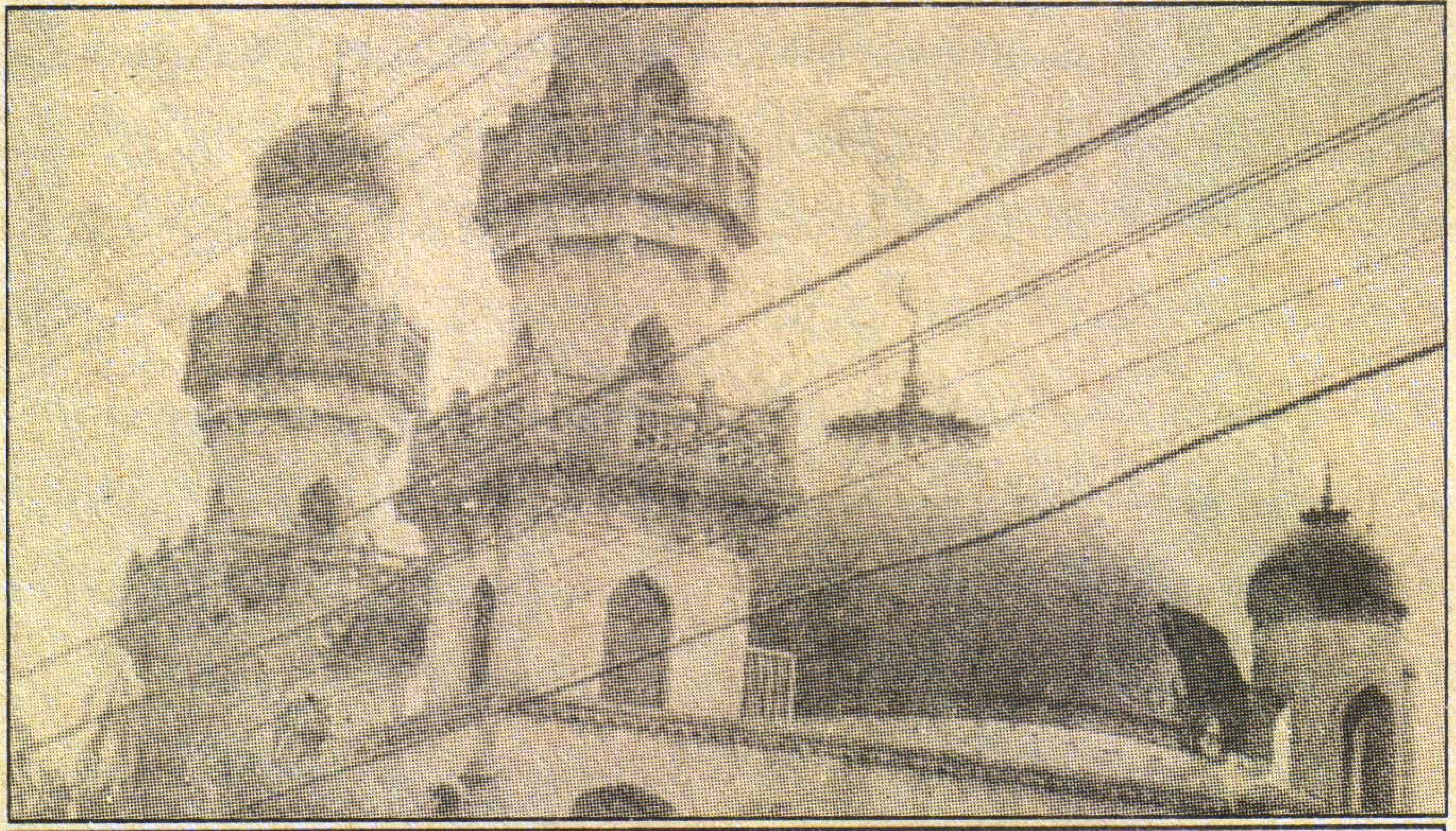
پوش عائشہ محسوس کرتی ہیں کہ اسلام نے ان کی زندگی کا تعین کر دیا ہے اور مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سے ایسے کپڑوں کے پانچ بڑے تھیلے بھر کر انہوں نے پھینک دیے جو اب ان کے شایان شان نہیں رہ گئے۔

تیس سالہ نورین جو خواتین کی یونیورسٹی میں نرسنگ کی معلمہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ اسلام سے پہلے بشمول عیسائیت کے انہوں نے کئی مذاہب کو آزمایا ہے۔ آخر اسلامی مرکز میں اپنی تعلیم کے دوران اسلام سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا اور وہیں ان کی ملاقات ان کے موجودہ اتیس سالہ شوہر سے ہوئی جو ایک فیکٹری میں ملازم ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر دونوں اس بات سے متفق تھے کہ مذہب کی اہمیت مقدم اور کام یا ملازمت کی ثانوی حیثیت ہے اس لئے نورین نے یونیورسٹی کی ملازمت ترک کر دی خصوصا اس خیال سے کہ وہاں پہنا جانے والا لباس اسلامی تعلیمات کے برعکس تھا۔ لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جاپان میں مسلمان مذہب اور حقیقی زندگی کو ایک دوسرے کے موافق بنالیتے ہیں۔ ایک پبلشنگ فرم میں ملازم جاپانی خاتون نے اعتراف کیا کہ وہ حجاب اسی وقت پہنتی ہیں جب اپنی مسلم سہیلیوں کے ساتھ ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار انہوں نے اپنی سہیلیوں کے اصرار پر برتھ ڈے کیک لے کر روزہ توڑ دیا تھا۔ بہت سے مسلمان جاپان میں ہندوستانی اور دیگر طرح کے ہوٹل کھولتے ہیں۔ وہ اپنے گاہکوں کو شراب بھی فراہم کرتے ہیں جب کہ اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔ ایسا وہ اس

ان کے مسلمان شوہر نے ان پر اسلام لانے کے لئے کبھی زور نہیں ڈالا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس پورے عرصے میں عائشہ کو اس طرف توجہ دلاتے رہے تھے۔ عائشہ کو سجدہ کرتے دیکھ کر ان کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

تیس سالہ نورین جو خواتین کی یونیورسٹی میں نرسنگ کی معلمہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ اسلام سے پہلے بشمول عیسائیت کے انہوں نے کئی مذاہب کو آزمایا ہے۔ آخر اسلامی مرکز میں اپنی تعلیم کے دوران اسلام سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا

لئے کرتے ہیں جاپان میں شراب کے بغیر ہوٹل کھولنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر بالغ مسلمان ان جیسی مشکلات پر قابو پا بھی لیں تو جاپان میں مسلمان بچوں کے لئے زندگی بہت دشوار ہے۔ نورین کا خیال ہے کہ ان کا دو سال کا بیٹا جسے انہوں نے اس کے دادا کے پاس پاکستان بھیج دیا ہے جاپان میں رہ کر صحیح معنوں میں اسلامی تربیت سے آراستہ کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اسے جاپان میں ایک نرسری میں رکھنا چاہا اور اس کے نگراں کو ہدایت دی کہ اسے کوئی چیز نہ کھلائیں پلائیں لیکن یہ خوف برابر دامن گیر رہا کہ اس بچے کے ساتھیوں میں سے اسے کوئی حرام شے نہ کھلادے۔ انہیں اب بھی ڈر ہے کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو بھی اس کی طرف سے یہی خدشہ لگا رہے گا کہ وہ کبھی برتھ ڈے میں جا رہا ہے تو کبھی کرسمس کی تقریب میں اور پھر یہ کہ اس کے لئے اچھے دوست بنانا بھی ممکن نہیں ہوگا۔



جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں ایک اسلامی مرکز

اس طرح کے مشکلات جیسا کہ نورین سمجھتی ہیں صرف کھانے پینے کے ہی معاملات میں نہیں ہیں بلکہ تصورات اور اقدار میں بھی ہیں۔ جاپان میں لوگ عموما یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جسم انسان کی ملکیت ہے اور بچے کو چاہئے کہ وہ پوری رات پڑھتا رہے اور امتحان کی فکر میں غرق رہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے جسم اللہ کی ملکیت ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ خود اپنے جسموں کے ساتھ احترام و عدل کا معاملہ رکھیں۔ □

کوئی عورت اپنے منشیات کے عادی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال۔ منگنی کی انگوٹھی پہننے کے بارے میں کیا حکم ہے۔؟

جواب۔ منگنی کی انگوٹھی کی حیثیت عام انگوٹھی سے مختلف نہیں ہے۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں جو انگوٹھی لڑکے کی طرف سے لڑکی کو دی جاتی ہے اس پر ہونے والے دولہے کا نام لکھا ہوتا ہے اور لڑکی والوں کی طرف سے دی جانے والی انگوٹھی پر لڑکی کا نام لکھا ہوتا ہے اور اس عمل کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ اس طرح متوقع زوجین کے درمیان رشتہ پکا ہوگیا جب کہ شرعی نقطہ نظر سے اس اعتقاد کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ابھی صحیح معنوں میں دونوں کو رشتہ ازدواج میں بندھنے میں خاصا وقت باقی رہتا ہے اور اس دوران خدا نخواستہ کوئی انہونی بات ہوجائے تو دونوں طرف کے لواحقین کو کتنا صدمہ اور پریشانی سے گزرنا پڑتا ہے۔ نام لکھی ہوئی انگوٹھی کے تبادلے کی وجہ سے اس صدمے کی شدت میں اضافہ ہوجانا قدرتی بات ہے۔ بعض جگہ اس انگوٹھی میں دلہن کی تصویر جڑنے کا بھی رواج ہے اس کا بھی شرعی جواز نہیں کیونکہ جو عورت ابھی کسی مرد کے نکاح میں داخل نہیں ہوئی وہ اس کی بیوی کیسے ہوجائے گی وہ تو نامحرم ہی رہے گی اور اس کی تصویر رکھنا کسی شکل میں لڑکے کے لئے جائز نہ ہوگا۔

سوال۔ کیا کسی اجنبی عورت سے اس طرح مصافحہ کرنا جائز ہے کہ دونوں کے ہاتھوں کے درمیان کوئی شے حائل ہو مثلاً دستانہ یا رومال۔؟

جواب۔ کسی مرد کا نامحرم عورت سے مصافحہ کرنا جائز نہیں خواہ براہ راست ہو یا درمیان میں مذکورہ اشیاء میں سے کوئی شے حائل ہو کیونکہ یہ فتنے کا موجب ہے۔ اللہ کا فرمان ہے "ولاتقربوا الزنا انہ کان فاحشہ وساء سبیلا" یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم ایسی ہر چیز سے ہر فعل سے اجتناب کریں جو زنا تک لے جانے والی ہو چاہے وہ زنا اپنے عام مفہوم میں ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور بات۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں مرد کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ کو مس کرے گا تو اس کے شہوانی جذبات کو تحریک ہوگی اور اسی لئے غیر محرم عورتوں سے مصافحہ کرنے کی شدید ممانعت احادیث شریفہ میں کی گئی ہے اور ضمن میں نوجوان اور عمر رسیدہ عورت میں کوئی تفریق نہیں برتی گئی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سن رسیدگی اور دوشیزگی کی حدیں مختلف افراد کے نزدیک مختلف ہوسکتی ہیں اور فتنہ وفساد کا اندیشہ دونوں صورتوں میں رہتا ہے اسی لئے اسلام کا موقف یہ ہے کہ کسی برائی کو اس کی جڑ سے ختم کرنا چاہئے۔



سوال۔ اگر کوئی عورت اپنے منشیات کے عادی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے اور یہ کہ ایسے شخص کے ساتھ زندگی کیسے گزاری جاسکتی ہے۔ وہ عورت بے اولاد بھی ہے اور ایسا کوئی اس کے اقارب میں ہے بھی نہیں جو اس کی خبر گیری کرسکے۔؟

جواب۔ اگر کوئی عورت اپنے منشیات زدہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو وہ اپنے اس مطالبے میں حق بجانب ہے کیونکہ اس کے شوہر نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے اور اس سے خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ طلاق ہونے کی صورت میں اگر ان کے یہاں کوئی اولاد ہے تو وہ ماں کے ساتھ رہے گی جب تک کہ وہ سات سال کی نہ ہوجائے اور باپ پر ان کے خرچ کی ادائیگی لازم ہوگی اور اگر نصیحت کرکے اور غیرت دلاکر اس کی حالت سدھارنے کی امید سے وہ عورت اس شخص کے ساتھ رہنا چاہے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔

سوال۔ کیا کسی بیٹے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس بنا پر اپنے والد کی نافرمانی کرے کہ اس نے بیٹے کو پڑھائی لکھائی کی دہائی دے کر شادی سے روکا اور کیا باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو شادی کے لئے زکوۃ دے۔؟

جواب۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بیٹے کو شادی کی ضرورت تھی اور والد نے اس سے انکار کیا پھر جواباً بیٹے نے باپ کی حکم عدولی کی تو یہاں پر بیٹا برحق ہے کیونکہ اس طرح کے مسائل کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور باپ کی ممانعت کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ باپ کے لئے درست نہیں کہ وہ بیٹے کی شادی میں حارج ہو۔ بلکہ باپ پر واجب ہے کہ وہ بیٹے کی شادی اپنے خرچ سے کرے اگر بیٹے کے پاس مال و دولت نہ ہو۔ تہی دست بیٹا اگر اپنے باپ سے کہے کہ میری شادی کر دیجئے تو باپ پر لازم ہے کہ اس کی شادی کا انتظام کرے۔

یعنی کہ باپ کے پاس اگر مال و متاع ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے بیٹے کی شادی کرے تاکہ وہ پاکبازی کی زندگی بسر کرے اور یہ کسی صورت میں باپ کو جائز نہیں کہ شرعی حکم ہوتے وہ بیٹے کو تعلیم کی تکمیل کے نام پر شادی سے روکے۔

شادی کسی طالب علم یا طالبہ کو تعلیم مکمل کرنے سے تو نہیں روکتی بلکہ اگر دونوں میں ہم آہنگی ہے تو ایک دوسرے کو حصول علم میں تعاون بھی دے سکتے ہیں۔

میری بیوی مجھے گھر والوں کی مدد سے روکتی ہے

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلے لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال میں دو سال سے شادی شدہ زندگی گزار رہا ہوں۔ میں اپنی شادی سے بہت خوش تھا۔ مجھے اپنی بیوی اور گھر سے حد درجہ لگاؤ ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بیوی اور گھر میرے خیال کا حصہ بن گئے۔ ایک سال تک یہی حالت رہی یہاں تک کہ مجھ پر اپنے گھر والوں کی بعض ذمہ داریاں اور ان کے مسائل میرے کندھے پر آپڑے جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میرے شب وروز اس طرح گزرنے لگے کہ بیوی اور بچے کی دیکھ ریکھ میں فرق آنے لگا اور میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ ان مسائل میں میری مصروفیت سے بیوی کو ناگواری ہونے لگی۔ میری پریشانی اس وقت اور بڑھ گئی جب اپنے گھر والوں کے پاس جانے کے لئے بیوی کے مطالبے میں اضافہ ہوتا گیا حالانکہ پچھلے ایک سال میں کبھی یہ تقاضا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیوی مجھے دانستہ طور پر نظر انداز کر رہی ہے اور جب بھی وہ سنتی کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس جا رہا ہوں تو اسے شکایت ہونے لگی اور کبھی کبھی تو وہ ایسا کرنے سے مجھے روکنے بھی لگی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچنے اور ان کے کاموں میں مدد سے قاصر رہتا۔ اب میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ خود کو درپیش مشکل سے کس طرح نمٹوں۔؟ (محمد احمد، گلبرگہ)

جواب۔ آپ کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ شادی شدہ زندگی ایک سال تک پرسکون انداز میں گزارنے کے بعد والدین اور گھر والوں کی طرف سے بعض ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو نبھانے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آپ کے گھر والوں کا یہ آپ پر حق بھی ہے۔ بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ان مشکلوں کی نوعیت ایسی ہو کہ ان کے پاس آپ کو مختلف اوقات میں آنا جانا پڑے جس سے آپ کے ازدواجی معمولات متاثر ہوں۔

آپ کو چاہئے تھا کہ گھر والوں کی طرف سے جو مسائل آپ کو درپیش تھے ان سے بیوی کو آگاہ کرتے اور اس کی وضاحت کر دیتے کہ کس مدت تک آپ کو ان کے پاس زیادہ دیر تک کے لئے ٹھہرنے اور انہیں درپیش ضروریات کی تکمیل کے لئے رہنا ہوگا۔ یہ آپ کی بیوی کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے گھریلو معاملات کو آپ کو درپیش حالات کے مطابق ایڈجسٹ کرے اور اس مرحلے میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کرے کیونکہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے والدین کا دارومدار آپ ہی پر ہے۔ آپ کا اپنے گھر والوں سے حسن سلوک ازدواجی زندگی کی راہ میں حائل ہونے والا نہیں ہے اور پھر ایسا بھی نہیں کہ لواحقین کی طرف سے غفلت، آپ نے کسی شوق میں پڑ کر برتی ہو۔ اس لئے آپ کی بیوی کو چاہئے تھا کہ اپنے وقت کو سوچ سمجھ کر صرف کرے اور بار بار آپ سے یہ مطالبہ نہ کرے کہ اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں جانے دیا جائے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بات اس وجہ سے ہو رہی ہو کہ آپ نے مذکورہ مسائل پر اپنی بیوی سے گفتگو نہیں کی تاکہ معاملات کی نزاکت اور ان کے تقاضوں کو سمجھ سکتی اور ایسے میں آپ کی پوزیشن کا اندازہ کر سکتی۔ عائلی زندگی میں یہ اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور اس میں کسی کو اختیار نہیں ہوتا بلکہ حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ اب آپ کو یہ کرنا چاہئے کہ اس بات کو سمجھیں کہ ایک نظام کے تحت بیوی اور بچے کے لئے بھی وقت نکالیں۔ ان دونوں کی ضروریات اور اپنے گھر والوں کی ضروریات کا موازنہ کر کے یہ طے کریں کہ ان میں کس کی تکمیل کب اور کس طرح کرنی ہے۔ بہت سے عائلی مسائل کا حل اسی طرح سوچ بچار سے نکلتا ہوا دیکھا گیا ہے یا کم از کم ان کی شدت میں کمی ضرور واقع ہوجاتی ہے۔ دونوں آپ کی توجہ اور التفات کے یکساں مستحق ہیں اور انہیں اس حق سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔

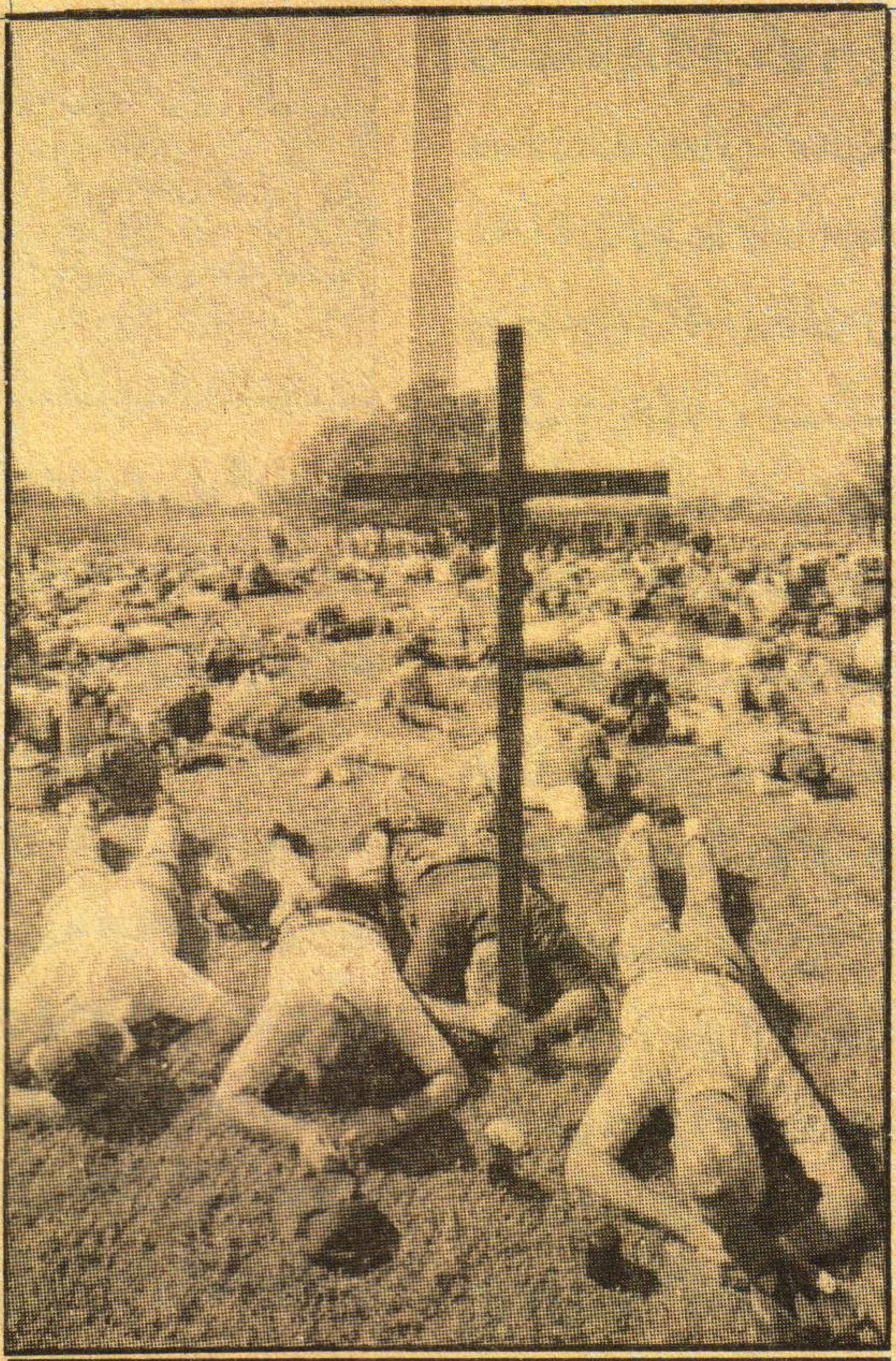
امریکہ میں امیدواران رحمت کا ظہور

ایک نئے مذہبی فرقے کے قیام و سجود کا چشم کشا مشاہدہ

ان کی تعداد کا شمار مشکل تھا۔ وہ بہت سے تھے ہر طرف پھیلے ہوئے واشنگٹن ڈی سی کے وسیع و عریض سبزہ زار میں ہر طرف مردوں کا اژدہام تھا۔ بلیو جینز، ٹی شرٹ اور مخصوص قسم کے جوتے پہنے ہوئے وہ سب کے سب بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز تھے۔ رحمتوں کے امیدوار خدائی امداد کے طالب زندگی کی اصلی مسرتوں کے حصول میں پھرنے والے لوگ امریکہ کے مختلف گوشوں سے جمع ہونے والے کوئی سات لاکھ مردوں کا یہ اجتماع موجودہ امریکی زندگی سے تنگ آکر روحانی سکون کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ واشنگٹن میں اب تک کا سب سے بڑا مذہبی اجتماع ہے

دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پریشان صورت لوگ رحمت کی امید میں یہاں تک آئے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں عجب سی چمک تھی ٹوپیاں سبزہ زار پر گری تھیں اور ہونٹوں پر خدا کی حمد کا نغمہ جاری تھا۔ پیشانیاں سجدے میں تھیں۔ وہ سب کے سب دوبارہ اٹھے پیشانی سے گرد صاف کی۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور خدا سے رحمت کی دعائیں طلب کرنے لگے۔ آنکھیں آنسوؤں سے تربتر ہوگئیں، چہرے بھیگ گئے، بہتوں پر رقت طاری ہوگئی۔ تب انہوں نے باواز بلند خدا کی تقدیس کا نغمہ گایا اور کوئی چھ گھنٹے تک خدا کی رحمت کے لئے زبان حال وقال سے ملتجی رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بلیو جینز کا کوئی سیلاب ہو جو واشنگٹن کے وسیع و عریض سبزہ زار پر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

سات لاکھ پریشان صفت لوگوں کے اس ہجوم نے امریکہ کی مصروف زندگی میں ایک ہلچل سی مچا دی ہے۔ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ اس نئے ابھرتے ہوئے مذہبی فرقے کا نام PromiseKeepers یعنی امیدواران رحمت ہے۔ بنیادی طور پر اس نئے فرقے کی تعلیمات عیسائیت سے اخذ کی گئی ہیں جو اپنے اراکین کو ایک اچھی خوشحال ازدواجی زندگی کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ امریکی زندگی میں روحانی بحران اور مسرت کے فقدان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا خاندانی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ ایک خوشگوار گھر کا تصور امریکی معاشرے میں ایک ناقابل حصول شئے بن گیا ہے۔ عورتوں پر رزق کے حصول کی ذمہ داری ڈال دینے سے چھوٹا سا گھر مادی طور پر خوشحال تو ہوگیا ہے لیکن جذباتی اور روحانی سطح پر مصروف ترین زندگی نے ہمارا سکون چھین لیا ہے۔ پھر جنسی بے راہ روی نے فساد کی ایک ایسی صورت حال پیدا کردی ہے جس میں رشتوں کا تقدس ختم ہوگیا ہے۔ شادی کے بغیر جنسی تعلقات کے عام ہوجانے سے انسان کے اندرون میں اب جنسی عمل سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو قدرت نے اس تعلق میں رکھا ہے۔ اس لئے امیدواران رحمت کے متلاشیوں کا کہنا ہے کہ ایک پرسکون زندگی جینے کے لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم نکاح کے رشتوں کو دوبارہ تقدس عطا کریں۔ جنسی بے راہ روی سے بچیں اور ایک اخلاقی پاکیزہ زندگی گزارنے کے لئے خود کو آمادہ کریں کہ اسی صورت میں خدا کی رحمت کے مستحق ہوسکتے ہیں۔



امریکی دارالحکومت میں امیدواران رحمت کی عبادت کا ایک منظر

البتہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سات لاکھ لوگوں کے اس اجتماع میں عورتوں کی دور دور تک کوئی شرکت دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ باران رحمت کے امیدوار بنیادی طور پر مردوں کی اخلاقی حالت درست کرنا چاہتے ہیں۔ شاید ان کے ذہن میں کہیں یہ بات ہو کہ اگر مرد اخلاقی طور پر بہتر

امیدواران رحمت کا کہنا ہے کہ ایک پرسکون زندگی جینے کے لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم نکاح کے رشتوں کو دوبارہ تقدس عطا کریں۔

ہوگئے تو عورتوں کی اصلاح کا کام خود بخود آسان ہوجائے گا۔ اس لئے کہ امریکی معاشرے میں مظلوم ترین مخلوق عورت ہے۔ جسے حصول رزق کی فکر کے ساتھ ساتھ بچوں کی پرورش بھی کرنی پڑتی ہے اور جسے مردوں کے مقابلے میں عام طور پر تنخواہیں خاصی کم ملتی ہیں۔ پھر اسے ہر وقت یہ دھڑکا بھی لگا ہوتا ہے کہ اس کے ڈھلتے شباب کے ساتھ ہی نہ جانے کب اس کے بوائے فرینڈ کی دلچسپی ختم ہوجائے۔ جب سے بغیر شادی کے ساتھ رہنے کا رواج عام ہوا ہے لوگ اس تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ خواہ مخواہ باقاعدہ شادی کا اہتمام کیا جائے۔ اس لئے کہ شادی شدہ جوڑوں کو علیحدگی کی صورت میں بڑے پیچیدہ قانونی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور طلاق پانے والی عورت کو شوہر کی ملکیت میں حصہ بھی مل جاتا ہے۔ اس لئے ان تکلفات سے بچنے کے لئے لوگ عام طور پر صرف دوستی کا سہارا لینا کافی سمجھتے ہیں۔ نئے مذہبی فرقے "باران رحمت" کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ اگر مردوں کو دیرپا شادیوں کی طرف راغب کیا جاسکا تو عورت کی موجودہ بے بسی کا خود بخود ازالہ ہوجائے گا۔

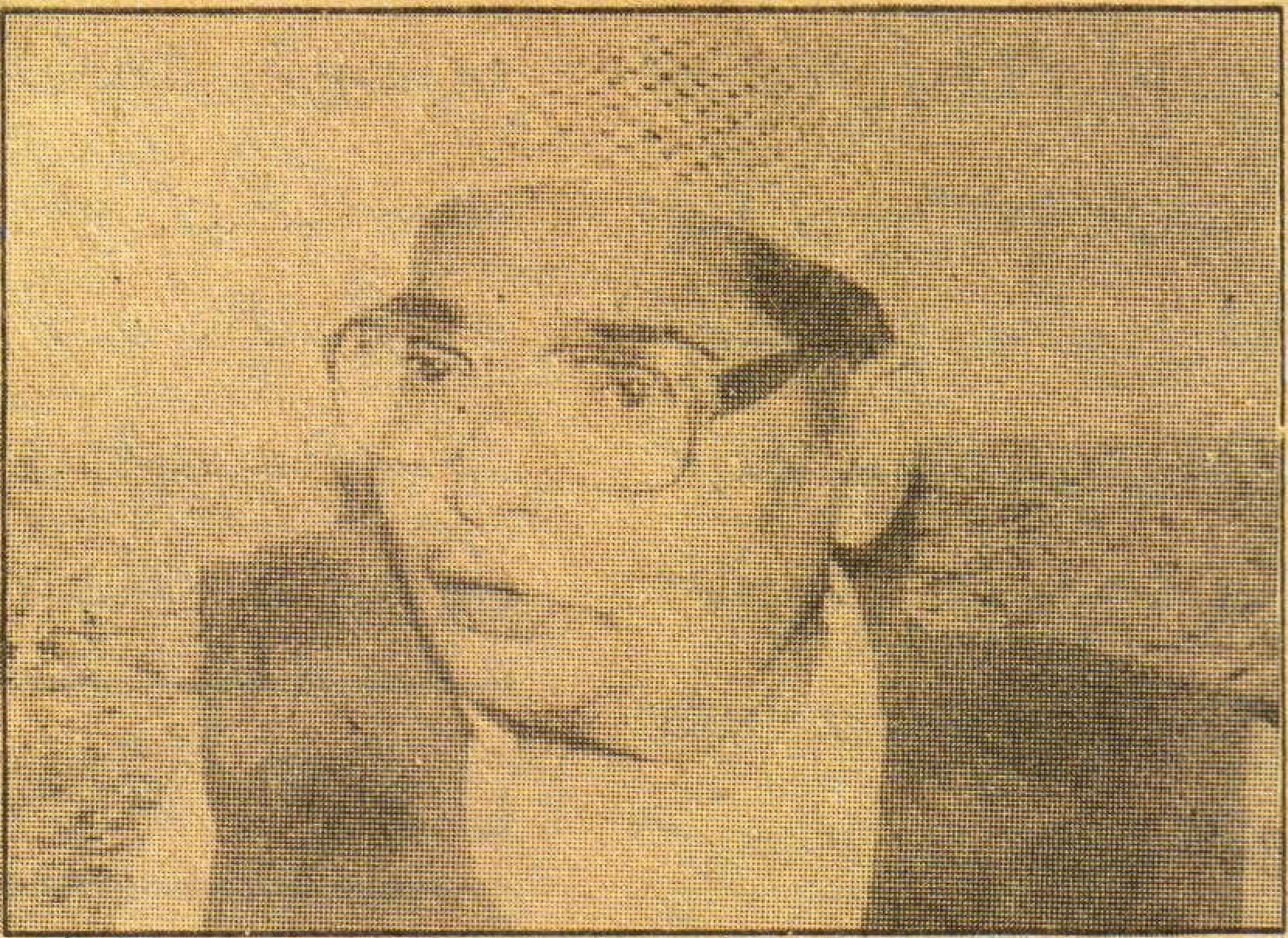
ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ۱۹۹۰ء میں اس نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ تب سے اب تک صرف سات سالوں میں اس کے پیروکاروں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ محرومیوں کے مارے امریکیوں کو اس نئی دعوت میں امید کی ایک کرن نظر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف سات سال کے اندر سات لاکھ لوگ ملک کے اطراف سے اپنے کام کاج چھوڑ کر امریکی دارالحکومت میں سجدہ ریز نظر آئے۔ کل تک ان میں سے ہر شخص یہ سوچتا تھا کہ وقت پیسہ ہے اور وقت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اس وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ اکٹھا کرلیا جائے۔ لیکن بہت سے پیسوں کے حصول کے بعد انہیں ایسا لگا جیسے ان کے اندرون میں کوئی چیز خالی خالی سی رہ گئی ہو۔ آج یہی لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر اپنے پیسے خرچ کرکے اپنے اندرون کو بھرنے کے لئے ڈی سی کے سبزہ زار تک آئے ہیں۔ کیا پتہ خدا ان رحمت کے متلاشیوں کو صحیح راہ دکھلادے۔ ▭

اور اب مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کے لئے ملی کونسل کا کاروان آزادی

ایں چہ بوالعجبی است یا فقیہ الامۃ

تحریر: کوثر فاطمہ

ایام گم گشتہ کے پچاسویں برس جب ملک کی دوسری قومیں آزادی کا جشن مناتی رہیں۔ مسلمانوں کا سواد اعظم جشن و طرب کی محفلوں سے خود کو الگ تھلگ محسوس کرتا رہا۔ عام مسلمانوں میں یہ شعور عام تھا کہ جس آزادی کی پچاسویں برسی ہے دراصل ان کی سیاسی محرومی کی پچاسویں برسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جشن آزادی کے پروگراموں میں مسلمانوں کی شرکت نمایاں طور پر کہیں بھی دیکھنے میں نہ آئی اور نہ ہی مسلمانوں کے کسی حلقے سے جشن آزادی کے سلسلے میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سیکولرزم اور ڈیموکریسی کے حوالے سے اس ملک کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں یہاں تک کہ جمعیۃ العلماء جیسی روایتی وطن پرست تنظیموں کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں میں جشن آزادی کے نغمے کو اعتبار دلانے کے لئے عوامی نوعیت کے پروگرام منعقد کرے۔ ہر خاص و عام کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ آزادی کی گولڈن جوبلی دراصل مسلمانوں کے احساس محرومی اور ان کی سیاسی غلامی پر منعقد کیا جانے والا جشن ہے۔



قائد کاروان آزادی: مجاہد الاسلام قاسمی

جن پچاس سالوں کو مسلمان ایام گم گشتہ سے تعبیر کرتے ہیں اور بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ پچاس سال ان کی ملی تاریخ کے تاریک ترین ایام ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ان ہی

تاریک ایام کو بعض لوگ روشن ترین ایام باور کرانے دینے پر مصر ہیں۔ حکومت اور غیر سرکاری ایجنسیوں کو تو چھوڑیئے دین اور شریعت کے حوالے سے گفتگو کرنے والے حضرات بھی اب اس امت کو آزادی کی پچاسویں برسی پر مبارکباد دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ گزشتہ دنوں جب ٹیپو سلطان کے مزار سے جشن آزادی کا جلوس نکالا گیا تو آزادی کے ان متوالوں میں وہ حضرات بھی آگے آگے نظر آئے جن کے ناموں میں حضرت مولانا جیسے القاب و آداب لگے ہوتے ہیں اور جنہیں اپنے فقیہ الامت ہونے پر اصرار بھی ہے۔ پھر اس کارواں کا شہرہ ان دو ریاستوں میں خاص طور پر رہا جہاں جنتا دل کی بنیادیں مضبوط ہیں اور کاروان آزادی کے جلسوں کو جن لوگوں نے خطاب کیا ان میں بھی جنتا دل کے مسلم لیڈران نمایاں طور پر نظر آئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کانگریس کی تقریبات آزادی میں شرکت سے جھجکتے ہیں یا بی جے پی کی گولڈن جوبلی رتھ یاترا سے خود کو غیر متعلق محسوس کرتے ہیں تو آخر جنتا دل کے نیم سیاسی مسلمانوں کی طرف سے نکالے جانے والے کاروان آزادی میں آخر ایسی کیا خاص بات ہے کہ وہ اس میں شریک ہونا ایک ملی فریضے کی ادائیگی خیال کریں؟ کیا صرف اس لئے کہ بی جے پی کے رتھ یاترا کے برعکس ملی کونسل کے کاروان آزادی کی قیادت حضرت مولانا جیسے لوگ انجام دے رہے ہیں؟

حیرت ہوتی ہے کہ دین و شریعت کا علم رکھنے والے حضرات آخر کس آزادی کی مبارکباد دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ جو لوگ فقہی موشگافیوں میں اصطلاحات کے بڑے بڑے دنگل منعقد کر سکتے ہوں جنہیں فروعی مسائل پر بال کی کھال نکالنے کا خاص ملکہ حاصل ہو وہ سیاسی مسئلے پر غور و فکر کرتے وقت اتنی موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھ پاتے کہ آپ جسے آزادی سمجھے بیٹھے ہیں وہ دراصل ہماری سیاسی محرومی کے اذیت ناک ایام ہیں۔ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے کسی آزادی کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم نے کلی طور پر نظام کفر سے اپنا پیچھا نہ چھڑا لیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنی پیرو کار کی حیثیت سے ہم پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ ہم انسانوں کے بنائے ہوئے نظام سے اور اس کی

ہر خاص و عام کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ آزادی کی گولڈن جوبلی دراصل مسلمانوں کے احساس محرومی اور ان کی سیاسی غلامی پر منعقد کیا جانے والا جشن ہے۔

شریعت کی رو سے مسلمانوں کے لئے کسی آزادی کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم نے کلی طور پر نظام کفر سے اپنا پیچھا نہ چھڑا لیا ہو

اطاعت سے نہ صرف یہ کہ خود آزادی حاصل کریں بلکہ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی نظام معصیت کے جبر سے نجات دلائیں۔ جب تک انسانی زندگی غیر اللہ کی اطاعت سے نکل کر کلی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں نہیں آجاتی ہمارے لئے کسی آزادی کا تصور ایک لغو خیال ہے۔ یہ ایک ایسا محکم شرعی اصول ہے جس سے اختلاف کی جرات بڑے سے بڑا سرکاری عالم بھی نہیں کر سکتا۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اہل شریعت کے دل و دماغ پر یہ موٹی سی بات واضح نہیں ہو پاتی؟

یہ تو ایک شرعی نکتہ تھا۔ وہ لوگ بھی جنہیں دین و شریعت سے واقفیت نہیں ہے یا جو شریعت کے حوالے سے گفتگو کے عادی نہیں ہیں ان کے لئے بھی یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہونی چاہئے کہ ایک قوم کی سیاسی حکمرانی سے نکل کر دوسری قوم کی سیاسی حکمرانی میں چلے جانے کو کسی بھی اعتبار سے آزادی کا ہم پلہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ آخر یہ کون سی آزادی ہے جس میں آپ ہر وقت اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کا رونا روتے رہتے ہیں جہاں پچاس سالوں سے مسلسل آپ کی نسل کشی کا دھیما دھیما نامحسوس عمل جاری ہے اور جہاں اس دردناک صورت حال سے نکلنے کے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے سارے راستے مسدود کردئے گئے ہوں۔ آپ کا حال اس پرندے کا سا ہے جس کے پر کتر دئے گئے ہوں جو اڑنے کے لئے صرف پھڑپھڑا سکتا ہو۔ اڑنا جس کے بس میں نہ ہو۔ بھلا اس اذیت ناک صورت حال کو اگر قابل قبول بنانے کے لئے کچھ لوگ اسے آزادی کا نام دے دیں تو اس سے صورت حال کی سنگینی میں کمی تو واقع نہیں ہو سکتی۔ البتہ دین اور شریعت کے حوالے سے اپنی شناخت بنانے والے لوگ اگر نظام جبر کو معتبر ٹھہرانے کے لئے میدان میں آجائیں تو اس سے چند لمحے کے لئے معصوم سادہ لوح مسلمانوں میں یہ تاثر عام ہوتا ہے کہ شاید شریعت کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہم موجودہ صورت حال پر مطمئن رہیں اور آزادی کی یہ نعمت نظام کفر کی شکل میں ہمیں عطا ہوئی ہے اس کے استحکام کے لئے فقہائے عظام کی قیادت میں ہر لمحہ سرگرم رہیں مبادا ایسا نہ ہو ہماری ذراسی کوتاہی سے یہ آزادی ہاتھوں سے پھسل جائے۔

کاروان آزادی جس کی قیادت امارت شرعیہ بہار کے "قاضی القضاۃ"

فقیہ الامت "حضرت مولانا" مجاہد الاسلام قاسمی" دامت برکاتہم" کے مبارک ہاتھوں انجام پا رہی ہے اور جسے شریعت کے حوالے سے معتبر بنانے کی کوشش ہورہی ہے آخر اس کاروان کا پیغام کیا ہے؟ کرناٹک میں کاروان کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جو باتیں کہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

"جس نے غلامی نہیں دیکھی وہ آزادی کا مزہ پا نہیں سکتا"۔

"آزادی کی گولڈن جوبلی کے دوران آزادی کے پہلے مجاہد حضرت ٹیپو سلطان شہید کی قربانیوں کو نظرانداز کردیا گیا۔ یہ بہت شرم کی بات ہے۔"

"مسلمان اس ملک کے مالک اور حصہ دار ہیں کرایہ دار نہیں"۔

"یہ بدقسمتی تھی کہ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کے تقسیم کی سخت مخالفت کی تھی"۔

یہ ہیں وہ فرمودات جو حضرت مولانا نے اس موقع پر ارشاد فرمائے۔ گو کہ جلسے سے خطاب کرنے والے دیگر سیاسی مسلمانوں نے ہمیں اس ملک کا آزاد

اگر انگریزوں کے اجنبی نظام حکومت میں مسلمان خود کو غلام محسوس کرسکتے ہیں تو غیر انگریز حکمرانوں کے ذریعے قائم کردہ نظام کفر میں وہ خود کو کیونکر آزاد محسوس کرسکتے ہیں؟

شہری باور کرانے کے لئے اور بھی بہت سی باتیں کہیں لیکن ہم سیاسی مسلمانوں کی باتوں کا سنجیدگی سے نوٹس لینا اس لئے بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کی باتوں کو عام مسلمانوں میں اب کوئی اعتبار حاصل نہیں رہا۔ البتہ قاضی صاحب چونکہ شریعت کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اس لئے اس کا امکان ہے کہ عام مسلمان کہیں ایسا نہ سمجھیں کہ جو باتیں محترم قاضی صاحب فرمارہے ہیں وہ عین مقتضائے شریعت ہیں اسی لئے ہم نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ موجودہ اذیت ناک صورت حال اور مکروہ سیاسی نظام کے قبیح چہرے پر اگر آزادی کا غازہ ملنے کی کوشش کی جارہی ہے تو عامۃ المسلمین کو صحیح صورت حال سے واقف کرایا جائے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر یہ کونسی آزادی ہے جس کا مزہ محترم قاضی صاحب کی زبان کو لگ چکا ہے اور ایام غلامی کو محض اجنبی حکمرانوں کے دور تک محدود کرنے کے لئے ان کے پاس شرعی جواز کیا ہے؟ اگر انگریزوں کے اجنبی نظام حکومت میں مسلمان خود کو غلام محسوس کرسکتے ہیں تو غیر انگریز حکمرانوں کے ذریعے قائم کردہ نظام کفر میں وہ خود کو کیونکر آزاد محسوس کرسکتے ہیں؟ آخر ان نازک مسائل پر شرعی حوالے سے گفتگو کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی جاتی؟ محترم قاضی صاحب کو اس بات کا بھی بڑا قلق ہے کہ آزادی کے پہلے مجاہد ٹیپو سلطان کی قربانیوں کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انتہائی شرم کی بات ہے لیکن ہمارے نزدیک اس سے بھی زیادہ شرم کی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو منجمد کردیا گیا ہے اور یہ کہ ہمارے درمیان دین و شریعت کا علم رکھنے والے لوگ بھی مسلمانوں کی محکومی اور بے بسی کو آزادی کا نام دینے کے لئے میدان میں نکل آئے ہیں۔ پھر قاضی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کے مالک اور حصہ دار ہیں کرایہ دار نہیں۔ جو لوگ شریعت کی معمولی شدبد بھی رکھتے ہیں انہیں یہ بات خوب معلوم ہے کہ یہ ملک ہی کیا مسلمان اس پوری کائنات کا وارث ہے اور ہمیں قرآن برملا الفاظ میں یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کی حکمرانی یا کسی کی شریعت قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ گویا شریعت کی رو سے مسلمان اس ملک کے حصہ دار نہیں بلکہ کلی طور پر وارث ہیں اور یہ کہ ہم کسی ایسے نظام کو تسلیم نہیں کرسکتے جس میں کفار و مشرکین کو اقتدار میں شریک کرنے کا امکان بھی پایا جاتا ہو۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اس سرزمین پر ایک ایسے نظام انصاف کو قائم کریں جس میں اقتدار کلی طور پر شریعت اسلامیہ کے حقیقی علمبرداروں کے ہاتھوں میں منتقل ہوجائے۔ اس معاملے میں اسلام کسی نظام سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا خواہ وہ اس ملک کا موجودہ سیکولر نظام ہی کیوں نہ ہو؟ پھر آخر کیا بات ہے کہ اس ملک کے غاصب اخلاق باختہ حکمرانوں سے کلی طور پر اقتدار چھیننے کے بجائے قاضی صاحب محض مسلمانوں کو اقتدار میں حصہ دار بنانے پر

یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ اللہ کی شریعت تو ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ ہم اس سرزمین کے باسیوں کو نظام کفر کی معصیت سے آزادی دلائیں لیکن ہم اس صریح ہدایت سے منہ موڑ کر اسی نظام کفر میں اپنی آزادی کا احساس عام کرنے کے لئے کاروان آزادی نکالیں۔

مصر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کاروان آزادی سے جو پیغام نشر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو موجودہ نظام میں حصہ دار بنانے کی جو مہم چلائی گئی ہے۔ اس کے لئے

نفس کیا ہیں؟ یہ ہدایت قرآن سے حاصل کی گئی ہے یا محض اپنے ذاتی رجحان اور ہوا و ہوس کی بنیاد پر مسلمانوں کو آزادی کا ذائقہ چکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دیکھا جائے تو کاروان آزادی کے پیچھے وہی از کار رفتہ سیاسی فکر کارفرما ہے جس میں مسلمانوں کو یہ احساس ستائے دیتا ہے کہ وہ تقسیم ہند کے ذمہ دار ہیں۔ یہی وہ GuiltComplex ہے جو موصوف کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ مولانا آزاد نے تقسیم ہند کی سخت مخالفت کی تھی۔ ہم جب تک اس احساس جرم سے خود کو آزاد نہیں کرتے اور موجودہ صورت حال کا شریعت کی رہنمائی میں جائزہ نہیں لیتے ہمارے لئے کسی راستے کی نشاندہی ممکن نہیں۔ ہم شریعت کی ہدایت سے منہ موڑ کر آزادی کا جتنا بھی بڑا جشن کیوں نہ منائیں۔ ہماری صورت حال بہتر نہیں ہو سکتی۔ یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ اللہ کی شریعت تو ہم سے یہ مطالبہ کرے کہ ہم اس سرزمین کے باسیوں کو نظام کفر کی معصیت سے آزادی دلائیں لیکن ہم اس صریح ہدایت سے منہ موڑ کر اسی نظام کفر میں اپنی آزادی کا احساس عام کرنے کے لئے کاروان آزادی نکالیں۔ □

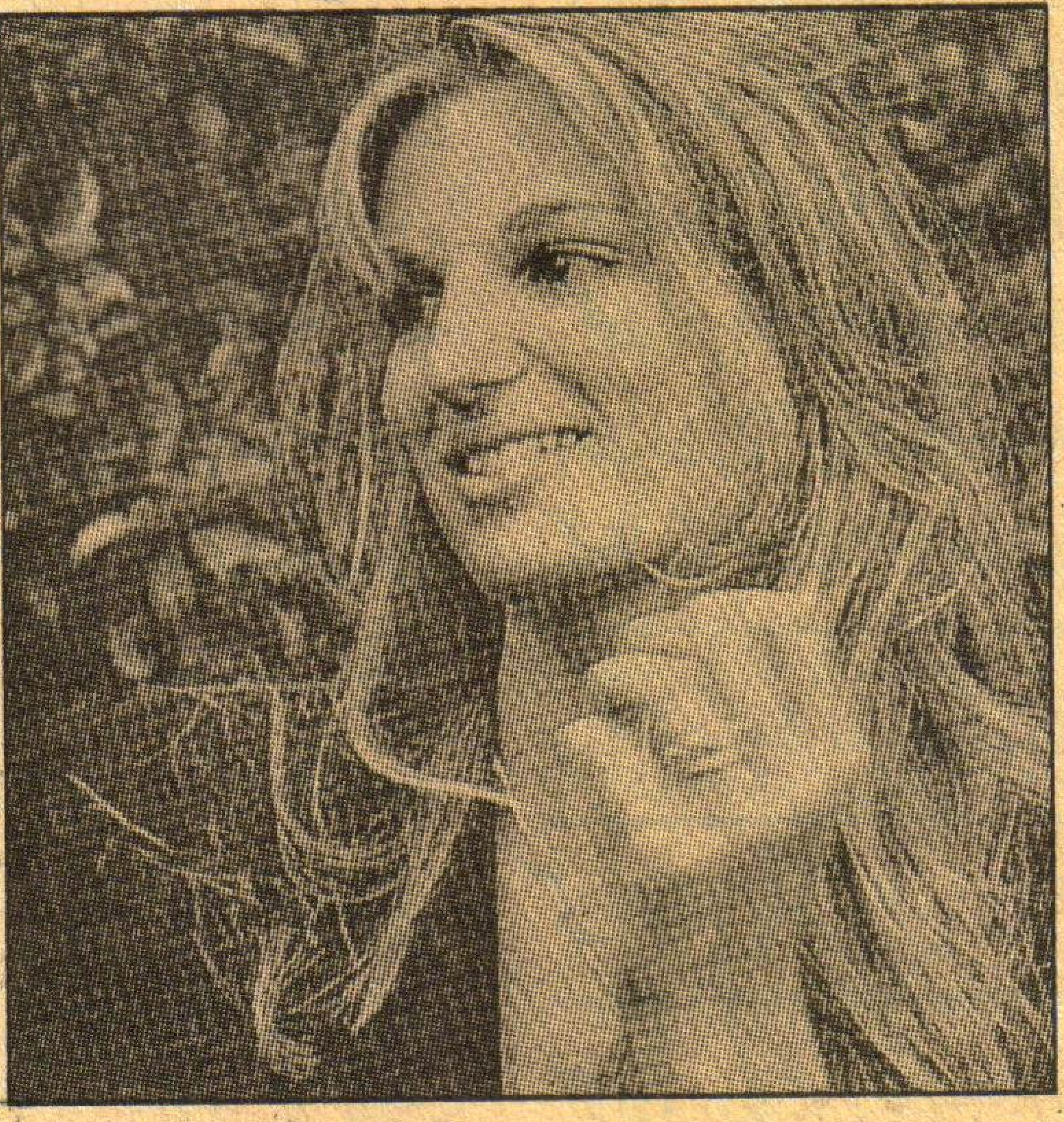
کیا جمیمہ ڈائنا کے نقش قدم پر چل سکتی ہیں

مغربی پریس میں جاری بحث پر چارلوٹی ایڈورڈس کا تبصرہ

شہزادی نجات دہندہ، درویش اور آخر کار رسائل کے سرورق کی زینت بننے والی حسینہ۔ زندگی کے دوران اور مرنے کے بعد بھی ویلز کی شہزادی ڈائنا بے شمار دلکش اور رنگین رسائل کا موضوع بنی رہی ہے۔ حال ہی میں معروف میگزین Vogue نے آخری لمحات میں اچانک اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کا مظاہرہ کیا اور پھر وینٹی فیر، کنٹری لائف، ہیلو، او کے اور پیرس لائف جیسے دیگر میگزینوں نے اس کے نقش قدم پر چلنے میں تاخیر نہیں کی۔ سبھی نے ڈائنا کو اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تعزیتی مضامین اور گوشے شائع کئے۔ ان رسائل کے ناشرین کے مطابق ان کی فروخت میں چالیس فیصد کا اضافہ ہوا ہے اور مزید اضافے کی توقع ہے۔

لیکن ان رسائل کے قارئین کی تعداد میں بے پناہ اضافے کے پیچھے سوال یہ نہیں ہے کہ اس اضافے کی حد کیا ہوگی بلکہ یہ ہے کہ ڈائنا کی جگہ لینے والا اب کون رہ گیا ہے۔ یعنی ذہنوں پر یہ سوال دستک دے رہا ہے کہ آنکھوں میں سما جانے والے چہرے کا بدل کیا ہے اور "جان بہار کہاں ہے تو" جیسی سرورق کی کہانی کی جگہ اب کیا چھاپا جائے۔ ڈائنا کے بغیر جسے ناشرین "پرنسس آف سیلز" بھی کہتے تھے نہ جانے کتنے فیشن میگزین اور مصور ہفت روزے اجڑ کر رہ گئے ہیں۔

ان سب باتوں کا مختصر جواب یہی ہے کہ ڈائنا کی جگہ لینے والا کوئی نہیں رہ گیا ہے، کوئی نہیں۔ "ہیلو" میگزین کے شاہی نامہ نگار جوڈی ویڈ نے بتایا کہ "جب ہمیں کسی سرورق کے سلسلے میں تصویر کے لئے انتظار کرنا پڑتا تو ہم جانتے تھے کہ اس کی ایک تصویر سونے میں تولی جانے کے قابل تھی۔ میڈیا کے ایک اور نبض شناس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میگزینوں میں شائع ہونے والے مواد کو بہ اعتبار موضوع چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی جرائم، کھیل کود، سیاست اور ڈائنا۔ اگر کبھی کوئی اہم خبر ہاتھ نہ لگے تو سمجھ لیجئے کہ ڈائنا کے بارے میں کچھ لکھ کر اس کی کمی پوری کر دی جائے گی۔



مسئلہ یہ ہے کہ اب وہ کس کے ذکر سے اپنے صفحات پر کریں گے۔ برطانوی شاہی فہرست میں ہیلن ٹیلر، سرینا لنلے، سارہ چیٹو میں ہر کوئی اپنے معمولی پن سے عوامی مقبولیت کو خود سے دور کرتا جا رہا ہے۔

اکثریت کا خیال یہی ہے کہ ڈائنا کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے کبھی پر نہ ہو سکے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ بے شک کوئی اور دلکش خد و خال والی عورت حسن کی رزم گاہ میں قدم رکھے گی لیکن ڈائنا کی دلکشی میں بہت وسعت تھی۔ بعض مواقع پر اس کی وجہ سے رسائل کی فروخت میں فرق واقع ہوا لیکن ایسا ہمیشہ ہوا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فرق اس وقت نظر آیا تھا جب اس کی تصویر سب سے پہلے Vogue

میں شائع ہوئی تھی یا کوئی ایسی مرکزی کہانی جو واقعی رسالے کے سرکولیشن پر اثرانداز ہو۔ مثال کے طور پر پیٹرک ڈمارچیلیر کی کھینچی ہوئی ہنوز نامعلوم تصویر چند ہفتے پہلے کے Vogue کے شمارے میں دیکھی گئی ہے۔ اسی طرح وینٹی فیئر کے سرورق پر ماریو ٹسٹینو کی کھینچی ہوئی تصویر چھپی تھی۔ شائقین آج بھی اس شمارے کی فرمائش کرتے ہیں۔ تاہم دوسرے چہروں کی تصویریں چھاپ کر بھی رسائل کی اچھی خاصی کمائی ہوتی رہی ہے۔ مثلاً میڈونا، سنڈی کرافورڈ، لنڈا ایونجلسٹا اور ڈیمی مور۔ ادھر جمیمہ خاں کی سرورق کی تصویروں نے لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے چہرے ہمیشہ نمودار ہوتے رہیں گے جو انڈسٹری میں ہلچل مچادیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ڈائنا نے لوگوں پر سحر کردیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا جمیمہ خاں کبھی اسی طرح دلوں پر حکومت کرسکیں گی؟

کہا جاتا ہے کہ جمیمہ کے شوہر عمران خاں نے ایک موقع پر کہا تھا "میں چاہتا ہوں کہ جمیمہ کو پاکستان میں اس سے زیادہ مقبولیت ملے جتنی ڈائنا کو برطانیہ میں حاصل تھی۔" یہ بات درست ہے کہ ویلز کی شہزادی جمیمہ اور عمران خاں سے ملنے لاہور آئی تو وہاں کے فوٹوگرافروں کا دعویٰ یہ تھا کہ انہوں نے ڈائنا سے کہیں زیادہ جمیمہ کی تصویریں فروخت کی تھیں۔ لیکن برطانوی میگزینوں سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوئی۔ جب بھی ڈائنا کی تصویر وینٹی فیئر کے سرورق پر چھپی اس کی فروخت ڈیڑھ سو فیصد بڑھ جاتی۔ "او کے" جیسے میگزین کے پرانے شمارے بھی اگر ان میں ڈائنا پر کوئی باتصویر مضمون چھپا ہو تو بیس فیصد زائد قیمت میں بکتے تھے۔ جمیمہ اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ڈائنا کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ "ہیلو" میگزین نے خیال ظاہر کیا ہے۔ جمیمہ نے مذہب تبدیل کرکے اور خود کو وقار کے تصور سے وابستہ کرکے بڑا مسئلہ پیدا کرلیا ہے۔ شانے سے پیر تک ڈھانکنے والے لبادے میں کھینچی گئی اس کی تصویروں کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوگا۔ نیشنل میگزین کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر کے مطابق فیشن کی دنیا سے ڈائنا کا تعلق تبادلاتی نوعیت کا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں جب اس کی شادی پرنس چارلس سے ہوئی تو اسے فیشن کی دیوی کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیک فیشن میگزینوں نے اسے اس مقام تک لانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انا ہاروے جیسے لوگوں نے اسے فیشن اور حسن کے انداز برتنے کے آداب سکھائے اور اس کے عوض شہزادی نے برطانوی فیشن انڈسٹری کو مستحکم کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس میں بنیادی طور پر کپڑے پہننے کا حیرت انگیز سلیقہ تھا۔ اس پر خوبی یہ کہ وہ دراز قد ورزشی جسم کی مالک اور حسین تھی۔ وہ تو گوڑے کا تھیلا پہن کر بھی غضب ڈھاتی تھی۔



امریکی میگزینوں کی مقبولیت بڑھانے کا سہرہ بھی شہزادی ڈائنا کے سر جاتا ہے۔ تیس لاکھ سے زیادہ سرکولیشن والے میگزین People نے اس کی بے مثال کشش کو اشتہا انگیز لیکن دل میں اتر جانے والی کشش سے تعبیر کیا تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں مذکورہ میگزین کی فروخت ڈائنا کی تصویروں کی بدولت پینتالیس گنا بڑھی ہے۔ people میگزین کے لاکھوں قاری اساطیری پری زادیوں جیسی اس حسینہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ اعتراف بھی ضرور کرتے ہیں کہ جتنے رسائل ڈائنا نے بکوائے شاید ہی کئی چہرے امریکی رسائل کے سرورق کی زینت بنے لیکن ڈائنا جیسی دھوم کوئی نہ مچا پایا۔

میرلین فیرو کی موت نے بھی لوگوں کو کچھ کم سوگوار نہیں کیا تھا لیکن ڈائنا جیسی شدت ان کی سوگواری میں نہ تھی۔ بیشتر ایڈیٹروں کا خیال ہے کہ ڈائنا جیسی دم خم والی سرورق کی دوشیزہ کی جگہ اگر کسی کو ملنے والی ہے تو وہ ہے شہزادہ ولیم کی اولین گرل فرینڈ کو۔ اپنے طلسمی حسن اور میڈیا نوازی سے قطع نظر یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ شہزادہ ولیم کی مرحوم ماں کے سائے سے خود کو آزاد نہ کراسکے گی۔ مختلف حوالوں سے ڈائنا کی یاد تازہ کرنے کی خواہش کئی برسوں تک رسائل کو خام مواد فراہم کرتی رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ "ہیلو" میگزین کے ایڈیٹر نے بتایا "ہمارے قارئین ڈائنا سے منسوب پرانے قصے سننے کے لئے بے چین ہیں اور چونکہ واقعتاً وہ دنیا کی پہلی عورت تھی جس کی تصویروں کا کوئی شمار نہیں۔ ڈائنا کے پرستاروں کے لئے تاریخی نوعیت کا خاصا مواد مل جائے گا۔"

اکثریت کا خیال یہی ہے کہ ڈائنا کی موت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے کبھی پر نہ ہوسکے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ بے شک کوئی اور دلکش خد و خال والی عورت حسن کی رزم گاہ میں قدم رکھے گی لیکن ڈائنا کی دلکشی میں بہت وسعت تھی۔

لگتا ہے نئی شادی کا پیغام مجھ سے میرے بچوں کو چھین لے گا

سوال

میری عمر ۲۸ سال ہے۔ شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور اس سے تین بچے ہیں سب سے بڑے کی عمر سات سال ہے۔ شوہر نے ہمارے لئے کوئی چیز چھوڑی نہیں جس سے کہ زندگی گزار سکیں۔ میرے باپ بہت ضعیف ہیں اور وہ بھی دنیا کی مال و متاع سے محروم ہیں۔ میرے بچوں کے نہ ہی کوئی چچا ہیں نہ چچا زاد بھائی بہن۔ روزی کا کوئی وسیلہ نہیں سوا اللہ پر توکل کے۔

میرے شوہر کا پہلی بیوی سے ایک بیٹا ہے۔ ساس زندہ ہیں مگر ان کا بھی یہ حال ہے کہ آنکھ سے معذور ہیں اور چلنے پھرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔ چارپائی سے اٹھنا بھی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک اچھے اخلاق کے حامل شخص نے جو ہمارے حالات سے پوری طرح واقف ہے اس نے میرے پاس شادی کے لئے پیغام بھیجا۔ میرا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ میں نے شادی کے لئے اس کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ مجھے اپنے بچوں سے جدا نہیں کرے گا۔ اس نے باقاعدہ اسٹامپ پیپر پر مجھے لکھ بھیجا کہ وہ میرے بچوں کی کفالت اور اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت پر راضی ہے اور اس میں اس کا مقصد اللہ کی رضا جوئی ہے۔

اس طرح میری اس سے شادی ہو گئی۔ میرے اس شوہر کی معقول آمدنی ہے۔ اس کے ساتھ میری اور میرے بچوں کی زندگی اطمینان اور خوشی سے گزر رہی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرے پہلے شوہر کا بیٹا اور شوہر کی ماں میرے بچوں کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں۔ اس کے لئے ان کی دلیل یہ ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے اور مجھے ان بچوں کی تربیت کا حق نہیں رہ جاتا۔ براہ کرم میری پریشانی حل کرنے کے لئے فرمائیں کہ بچوں کی دیکھ ریکھ اور تربیت کا حقدار کون ہے؟

(سعدیہ حمید، بیجاپور)

جواب

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ سائلہ اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند ہے اور دوسری طرف وسائل کا فقدان ہے۔ اسی لئے اس نے ایک ایسے نیک دل آدمی سے شادی پر رضامندی ظاہر کی کہ جو بچوں کی کفالت و تربیت میں اس کی مدد کرنے پر تیار ہے۔ ان پر جو پیسہ وہ خرچ کرے، جو وقت ان کی تربیت میں لگائے وہ احسان کے زمرے میں ہوگا اور اس کے لئے سائلہ کو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ عموماً بچوں کی پرورش کے حق کا معاملہ قانونی اور عدالتی نوعیت کا ہوتا ہے جس پر عدالتی فیصلہ حاصل کرنا ہوتا ہے اور اس میں طرفین کے بیانات کی سماعت ضروری قرار پاتی ہے۔ فیصلہ بچوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی دیا جاتا ہے۔

سائلہ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس نے دوسرے شخص سے شادی کی پہلے شوہر کے انتقال کے بعد۔ موجودہ شوہر نے نہ صرف یہ کہ اس کے بچوں کی تربیت میں اس کی مدد کرنے بلکہ انہیں اپنے پاس رکھنے اور نگہداشت کی بھی اجازت دے دی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری گود میرے بیٹے کے لئے پناہ گاہ اور میری چھاتی اس کی سیرابی کا ذریعہ تھی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اس کو مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر تمہارا حق سب سے زیادہ ہے جب تک کہ تم نکاح نہ کرلو۔

مذکورہ حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ عورت اگر دوسری شادی کرلے تو بچے کی پرورش پر اس کا حق ساقط ہوجاتا ہے بشرطیکہ باپ کی طرف سے اعتراض ہو۔ لیکن اگر معترض باپ کے علاوہ کوئی اور ہو اور دوسرا شوہر اس عورت کے بچوں کی پرورش پر راضی ہو تو ماں کا حق ساقط نہیں ہوگا۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم نے بھی ایسی صورت حال میں عورت کے حق پرورش کے عدم سقوط کی حمایت کی ہے۔

اس کا تعلق مخصوص ضابطے سے ہے۔ عورت کے دوسرا نکاح کرلینے کی شکل میں پہلے شوہر کے بچوں کی پرورش کے حق کے سقوط کا حکم دوسرے شوہر کے حق کی رعایت سے دیا گیا ہے کیونکہ اگر وہ پہلے شوہر کے بچوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال میں لگی رہے گی تو دوسرے شوہر کی خواہشات کی تکمیل میں کوتاہی کا احتمال ہے اور اگر شوہر کی طرف پوری توجہ دے گی تو ادھر مصروفیت بڑھے گی تو بچے کی دیکھ بھال میں کمی آئے گی۔ لیکن اگر دوسرا شوہر خود ہی اپنی بیوی کے پہلے شوہر کے بچوں کی پرورش اور تربیت میں دلچسپی لینے لگے تو وہ اندیشہ از خود زائل ہوجاتا ہے جس کی بناء پر عورت کو عقد ثانی کرلینے پر حق پرورش سے محروم کردیا جاتا ہے۔ یعنی کہ جس کے حق کے تحفظ کے لئے عورت کے حق پرورش کو ساقط کیا جارہا ہے اگر اسی کو اعتراض نہیں ہے تو عورت کا حق پرورش بھی ساقط نہیں ہوگا۔

سوال

میں کالج کی طالبہ ہوں اور احکام الٰہی کی پابند ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے جب والد حیات تھے تو ایک اچھے اخلاق و کردار کا نوجوان ان کے پاس ملازم تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اس نوجوان نے نوکری چھوڑ دی اور اپنے حالات بہتر کرنے کی غرض سے ایک یوروپی ملک میں چلا گیا جہاں اس نے خاصا عرصہ گزارا۔ اللہ نے اس کے حالات بہتر کئے

اور وہ خوشحال و مالدار ہو کر وطن لوٹا۔ اس نے میری ماں سے میرا ہاتھ مانگا تو ماں نے انکار کر دیا باوجود اس کے کہ وہ بہت با اخلاق ہے اور یہ کہ اس کی اخلاقی حالت سے ہم لوگ پہلے سے واقف ہیں۔ میں ایک ذمے دار فرد کی حیثیت سے اس سے شادی کی اول تا آخر تمام ذمہ داریاں نبھانے کا تہیہ کرتے ہوئے ماں کے سامنے آگئی اور میں نے ان کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ پھر کیا تھا وہ سخت غصے میں آگئیں۔ میری کالج کی فیس اور کتابوں کا خرچ بند کر دینے کی دھمکی دی۔ یہاں تک کہ میراث سے بے دخل کرنے کا حکم بھی سنایا اور مجھ پر سختی کرنے لگیں۔ میں اپنے ماموں کے پاس گئی کہ بیچ میں پڑ کر اس مشکل کو حل کرا دیں لیکن ماموں نے بھی یہ کہہ کر مایوس کیا کہ تم ایسے شخص سے شادی کیسے کر سکتی ہو جو تعلیم میں تم سے کمتر ہو اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ اس نوجوان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میں عجیب کشمکش و پیچ میں ہوں کہ میں اپنے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر اس نوجوان سے شادی کروں کہ نہ کروں۔؟ (نائلہ بی۔ رامپور)

جواب خط میں ان اسباب کا ذکر بالکل نہیں کیا گیا ہے جس کی بناء پر آپ کی والدہ نے اس نوجوان کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغام کو ٹھکرایا اور اتنی شدت سے اس کی مخالفت کی۔ دونوں کے درمیان محض اقتصادی فرق ہے یا اس کے ساتھ تعلیمی، سماجی اور ثقافتی اور تہذیبی فرق بھی ہے جس نے آپ کی والدہ کو اتنا غصہ دلا دیا کہ وہ آپ کو میراث سے بھی محروم کرنے کی دھمکی دینے لگیں۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ کوئی بیچ میں پڑ کر آپ کے لئے اس نوجوان سے شادی کی راہ ہموار کر دے تو شاید کسی ایسے شخص کا سامنے آنا مشکل ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں گھر والوں کی رضامندی کے بغیر اس شادی کو بخیر و خوبی انجام دلوا دوں گا۔ گھر والوں کی مرضی کے بغیر اس شادی کا ہو جانا مسئلے کا حل نہیں بلکہ زیادہ بڑی مشکلوں کا نقطہ آغاز ہے۔ یہاں ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آپ کالج میں ضرور پڑھتی ہیں لیکن پوری طرح ذمہ داری کے احساس کی پختگی میں ابھی وقت ہے۔ سوچئے کہ گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کا انجام کیا ہوگا۔ آج جتنی مخالفت آپ کی ہو رہی ہے کل اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ ان کی اخلاقی حمایت سے آپ خود کو محروم کر لیں گی اور جس سماج میں آپ رہتی ہیں اس میں ایسا عمل باعث شرم بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مزید پریشانیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ پھر یہ کہ یہ شادی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ساتھ آپ کی زندگی کا خاتمہ ہے۔ آپ ابھی زیر تعلیم ہیں اور کم عمر بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کی رائے بھی بدلے اور آپ کے گھر والوں کی بھی ہماری نصیحت یہی ہے کہ کوئی قدم آپ ایسا نہ اٹھائیں جس سے آپ کے گھر والوں کو سبکی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر واقعی یہ نوجوان آپ سے شادی کرنے کا خواہشمند ہوگا اور آپ کی عزت عزیز رکھتا ہوگا تو بغیر آپ کے گھر والوں کی مرضی حاصل کئے آپ کو شادی پر مجبور نہیں کرے گا۔

سوال میں صوم و صلوٰۃ کی پابند لڑکی ہوں۔ اکثر مجھے عزیز و اقارب، شادی بیاہ کی تقریبات میں بلاتے ہیں جو عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہوتی ہیں۔ مردوں سے اختلاط نہیں ہوتا۔ کیا ایسی تقریبات میں مجھے شریک ہونا چاہیے۔؟ (حنا زاہدہ، جدہ)

جواب نکاح کے اعلان، اس مناسبت سے دف بجانا اور عورتوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ ساری باتیں شرع کی رو سے جائز ہیں۔ محمد بن حاطب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کے موقع پر حلال و حرام کے درمیان آواز اور دف حد فاصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام احمد کا قول ہے کہ شادی کی محفل میں نغمہ سرائی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی عورتوں کو شادی کی تقریب میں تہنیتی نغمے گانے کی اجازت دی تھی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوستوں اور عزیزوں کی شادی میں شرکت کا شرعی جواز ہے بشرطیکہ اس میں مردوں سے اختلاط نہ ہو۔ جذبات انگیز موسیقی اور نغمے نہ ہوں۔ جن محفلوں میں منکرات اور غیر شرعی باتوں کا احتمال ہو اس میں عدم شرکت ہی بہتر ہے۔ ہاں صرف ایک شخص کے لئے ان میں جانے کی گنجائش نکلتی ہے یعنی وہ جو پند و نصیحت کرتا ہے اور منکرات کو معروفات میں بدلنے یا ان کی شدت کو کم کرنے کی سعی کرتا ہے یا ان کے عادی لوگوں کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے، انہیں صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرتا ہے۔

شاید سائلہ کو عزیزوں کی ان شادیوں میں بھی جہاں مردوں سے اختلاط نہ ہوتا ہو جانے میں تکلف ہوا ہو اور گمان گزرا ہو کہ ایسی تقریبات میں شرکت بھی باعث عذاب ہے۔ لیکن مذکورہ جواب کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ تقریب جس میں منکرات کا امکان نہ ہو اس میں شرکت کی اجازت ہے۔

عامر بن سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ ایک بار وہ قرظہ بن کعب اور ابو مسعود انصاری کے یہاں ایک تقریب میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ باندیاں گا رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ دونوں کے نزدیک اصحاب رسول اور اہل بدر میں سے کس نے یہ عمل کیا ہے۔ ان دونوں حضرات نے جواب دیا۔ اگر تم چاہو تو بیٹھ جاؤ اور ہمارے ساتھ وہی سنو جو ہم سن رہے ہیں اور اگر جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔

اسلام تعدد ازدواج کی اجازت نہیں بلکہ رخصت دیتا ہے

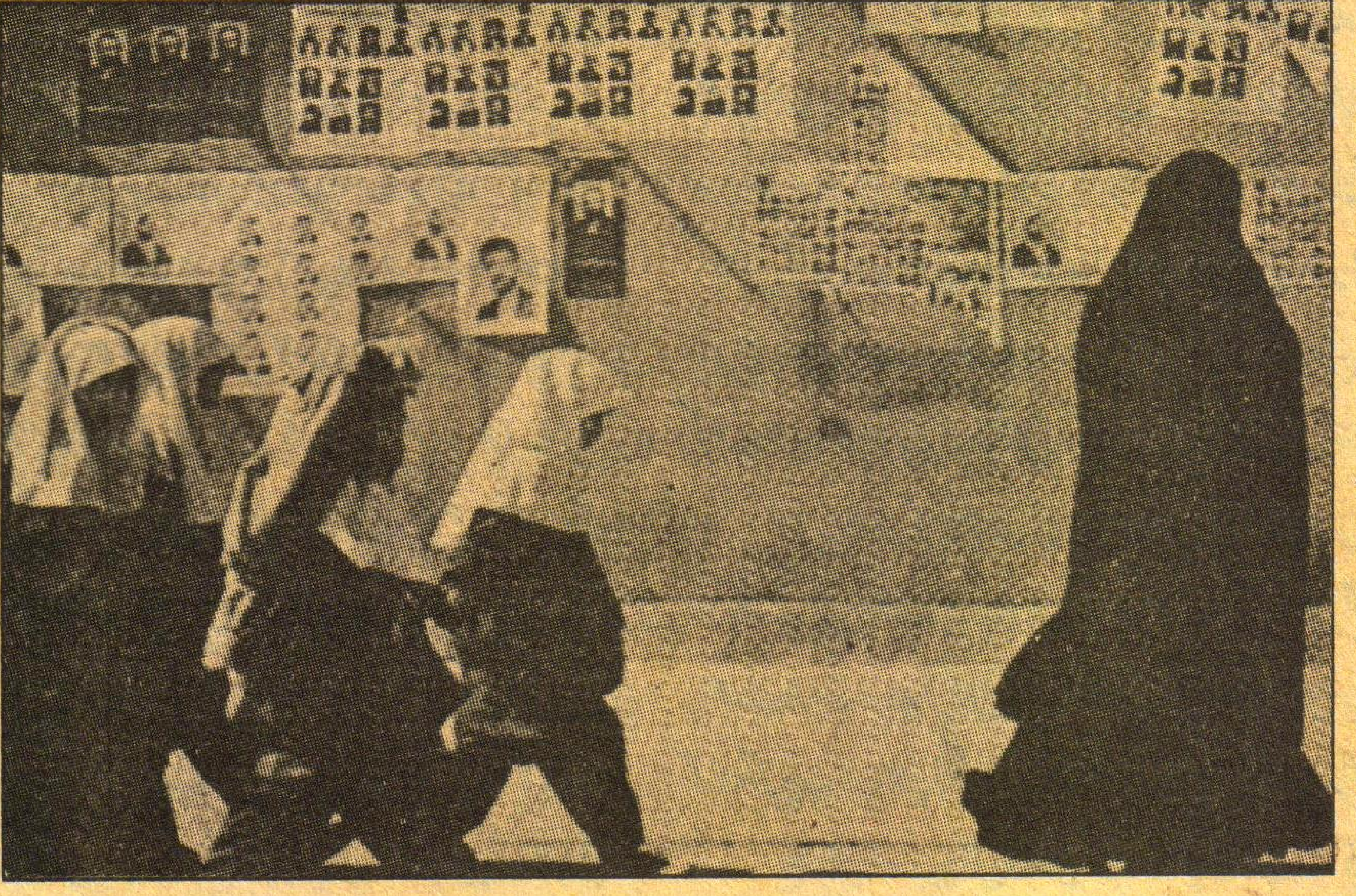
ایک نازک مسئلے پر ایک علمی کتاب کا تعارف

تلخیص و ترجمانی ۔ س۔ احمد

نام کتاب	:	The Empowerment of Woman in Islam
مصنف	:	ڈاکٹر زینت شوکت علی
قیمت	:	بیس ڈالر

ڈاکٹر زینت شوکت علی نے اپنی حالیہ تصنیف "امپاورمنٹ آف ویمن ان اسلام" میں تعدد ازدواج پر اسلامی موقف کے تئیں سنگین غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ انہوں نے اس پر تاکید کی ہے کہ اسلام میں تعدد ازدواج اور اسلام کی طرف سے اس کی کھلی اجازت کے عام مفروضے کے پیش نظر اس موضوع پر گہرائی سے نگاہ ڈالنا ضروری ہوگیا ہے۔ قبل از اسلام عرب میں تعدد ازدواج اور کثیر زوجگی سے متعلق رائج قوانین پر نہ صرف نظرثانی بلکہ اسلام کی آمد کے نتیجے میں ان شعبوں میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ ساتھ ہی اسلامی بنیادوں پر بعض ایسے جدید قانونی نظاموں کا جائزہ بھی ضروری ہے جنہوں نے اپنے طرز عمل کو منضبط کرنے کے لئے اس کا قانونی جواز اختیار کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی عام اجازت نہیں ہے بلکہ محدود رخصت ہے۔

زمانہ قدیم سے آج تک تعدد ازدواج اور کثیر زوجگی کو کسی معاشرے میں قبولیت حاصل رہی ہے تو کسی میں اس کی مذمت ہوتی رہی ہے۔ تمام تر مشرقی اقوام میں تعدد ازدواج ایک تسلیم شدہ ادارہ تھا۔ مذہب کے سائے میں پروان



چڑھتی ہوئی شہنشاہیت نے اپنے اس عمل کو عوام کے سامنے تقدیس کا روپ دے کر پیش کیا۔ اہل اسپارٹا نے اس روایت سے انحراف کرکے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا اور وہ تھی کثیر زوجگی کا جس میں ایک مرد کو کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت تھی لیکن ایک عورت کے کئی شوہر ہوسکتے تھے۔

تعدد ازدواج کی روایت رومی دنیا میں جسٹینی عہد (Justinian Era) تک برقرار رہی جب آداب زندگی میں تیرہ صدیوں پر محیط ارتقاء کے تجربے کے نتیجے میں تعدد ازدواج کے انسداد کے لئے قوانین وضع کئے گئے۔ تاہم یہ قوانین تعدد ازدواج پر قابو پانے میں ناکام رہے اور ان کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ باضابطہ جدید خیالات اور اصولوں نے اس طریقہ کار کی مذمت نہ کردی۔ اس مذمت کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی کے سوا باقی بیویاں بڑی بے کسی کی زندگی گزارتی تھیں اور انہیں کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ ان دیگر بیویوں سے ہونے والی اولاد حرامی کے نام سے یاد کی جاتی تھی اور انہیں اپنے باپ کی جائداد میں سے کسی بھی حصے کا استحقاق نہیں تھا بلکہ انہیں معاشرہ سے باہر کا فرد تصور کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ لارڈ برائس نے اپنی تصنیف "اسٹڈیز ان ہسٹری اینڈ جیورسپروڈنس" میں لکھا ہے کہ روم کی عورتیں اپنے شوہروں کی غلام بن کر رہتی تھیں، اپنے ماں باپ کے گھر سے وہ اس طرح نکال دی جاتی تھیں کہ وہاں سے ملنے والی میراث شوہر کی ہی ملکیت ہوجاتی تھی شوہر کے سامنے اس کی حیثیت وہی تھی جو ایک مجرم

خود مسیحی دنیا ماضی میں صرف یک زوجگی پر کاربند نہیں رہی ہے اور بہت سے مصنفین کے نزدیک مستقبل میں بھی اس کا امکان نہیں ہے اور اگرچہ عہد نامہ جدید میں یک زوجگی کو ازدواج کی عام یا معیاری شکل قرار دیا گیا ہے تعدد ازدواج کو یکسر قلم زد بھی نہیں کیا گیا ہے۔

کی منصف کے حضور ہوتی ہے۔ قصوروار پائے جانے کی صورت میں شوہر اسے جان سے بھی مار سکتا تھا وہ اسے کسی دوسرے شخص کی غلامی کرنے کے لئے فروخت کر سکتا تھا اور کسی مقدمے میں اسے مدعی کے حوالے کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش بھی ہو سکتا تھا۔



مسیحی ضابطہ ازدواج نے رومی قوانین پر بعض اعتراضات کئے۔ ورسلے بوڈن کا خیال ہے کہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ کلیسا کے اثرات نے عورتوں کو بے حیثیت کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سینٹ اگسٹائن جنہوں نے تارک الدنیا ہو کر ازدواجی زندگی کے خیال کو خیرباد کہہ دیا تھا تعدد ازدواج اور شاہدان بازاری سے اختلاط کو ازدواج کے ہی زمرے میں رکھتے تھے اور وہ ان کے نزدیک اتنی ہی ناگزیر تھیں جتنی کسی محل کے لئے نالیاں۔ ان کی نظر میں ازدواج کی زیادہ سے زیادہ حیثیت گناہ کے علاج کی تھی اور انہوں نے شادی شدہ عورت پر شوہر کی غلامی، اس کی بے راہ روی اور بدسلوکی کو ہنسی خوشی برداشت کرنا فرض قرار دیا۔ اس طرح سینٹ جیروم نے عقد ثانی کرنے والی عورت کو تھوک کر چاٹنے والے کتے اور بدمستی میں اینڈنے کی جگہ تلاش کرنے والے سور سے تشبیہ دی۔

خود مسیحی دنیا ماضی میں صرف یک زوجگی پر کاربند نہیں رہی ہے اور بہت سے مصنفین کے نزدیک مستقبل میں بھی اس کا امکان نہیں ہے اور اگرچہ عہد نامہ جدید میں یک زوجگی کو ازدواج کی عام یا معیاری شکل قرار دیا گیا ہے تعدد ازدواج کو یکسر قلم زد بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ایسی کوئی پابندی ہے تو اس کا اطلاق بشپ اور ڈیکن (کلیسائی نظام میں دنیوی معاملات کا منصرم) پر ہی ہوتا ہے۔ آئرلینڈ کے بادشاہ، میرو ونجی حکمراں اور چارلی مین ان سب کے محل میں دو تین رانیاں اور کئی کئی داشتائیں تھیں۔ مؤخر الذکر کے وضع کردہ ایک قانون سے پتہ چلتا ہے کہ تعدد ازدواج کی روایت سے کلیسا نامانوس نہیں تھا۔ چارلی مین کا خیال تھا کہ تعدد ازدواج خدا کی طرف سے ممنوع نہیں ہے کیونکہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ غالباً یہیں سے تحریک حاصل کر کے بعض مسیحی مسلکوں میں تعدد ازدواج کی وکالت کی گئی ہے ۱۵۳۱ء میں عرب اصطباغیوں (Baptists) نے Munster میں کھلے عام یہ تعلیم دی تھی کہ جو سچا مسیحی بننا چاہے وہ کئی بیویاں رکھے۔ مارمنی عیسائی آج بھی تعدد ازدواج کی دل کھول کر حمایت کرتے ہیں بشرطیکہ مرد ایک سے زائد بیویوں کی مالی کفالت کی استعداد رکھتا ہو۔

۱۸۴۸ء میں جان ہمفری نوئس کی امریکہ کے میڈلسیون کنٹری میں قائم کردہ اونیڈا کمیونٹی نے جنسی رشتوں کا ایک نیا نظام وضع کیا جس کے تحت کمیونٹی کے سارے مرد اس کی تمام عورتوں کے حقیقی یا متوقع شوہر ہو سکتے ہیں البتہ ہر مرد کو ہر عورت سے بچے حاصل کرنے کی آزادی نہیں تھی۔ نوئس نے اپنا اصول عہد نامہ جدید کی اپنی ذاتی تقسیم وتعبیر کی بنیاد پر وضع کیا تھا اور ایسی شادیوں کو مخلوط ازدواج کا نام دیا تھا۔ آگے چل کر ۱۸۷۹ء میں نوئس نے یہ تجویز رکھی کہ مخلوط ازدواج کے طریقہ کار سے لوگ دستبردار ہو جائیں جس کا مطلب اس کے مجوزہ عقیدے اور اس ادارے کی متوقع قطعیت سے انحراف نہیں بلکہ عوام کے جذبات کا احترام ہے۔

اپنی کتاب Antiquities of India میں بارنس نے اس مشاہدے کا ذکر کیا ہے کہ یک زوجگی کو جس کا خاتمہ داشتہ گیری کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ویدک عہد میں عام دستور تھا لیکن معزز خاندانوں میں پھر بھی تعدد ازدواج کا

"اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ان کے سوا) جو عورت تم کو پسند ہیں دو دو، یا تین تین، یا چار چار ان سے نکاح کرلو۔ پس اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے"۔ (النساء۔ ۳)

رواج تھا اور یہ بات ان کے لئے باعث شرم بھی نہیں تھی۔ انہی کی نظیر پر دوسروں نے بھی عمل کرنا شروع کیا۔

موجودہ دور میں دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور خیالات میں ترقی کے ساتھ تعدد ازدواج کی روایت کی مخالفت میں شدت پیدا ہوئی ہے اور خصوصا مغرب میں ایسے ترقی پسند نظام وضع ہوچکے ہیں جو کثیر ازدواجی رشتے کی سرگرمی کے ساتھ مخالفت کر رہے ہیں۔

جہاں تک اسلام میں تعدد ازدواج کے تصور کا سوال ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ پیغمبر اسلام نے اپنے قانونی نظام میں تعدد ازدواج کو جگہ نہیں دی تھی جیسا کہ لوگ سہل پسندی کی بناء پر فرض کرلیتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو ایک ایسے نظام کے درمیان پایا جہاں تعدد ازدواج نہ صرف عربوں میں بلکہ اہل فارس اور اہل یہود کے یہاں بھی ایک مشترک طرز عمل تھا۔ سماجی اور جنسی سطح پر عورتوں پر ظلم و زیادتی کا تعین اس زمانے کی تاریخ سے کیا جاسکتا ہے جب عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کردیا کرتے تھے اور عورتیں ترکے کے لازمی جزد کی حیثیت سے ورثاء کو منتقل ہوجاتی تھیں۔ مسیحیت نے انہیں بے روح وجود گردانا اور منحوس چڑیل کا نام دے کر جلایا، یہودیوں نے اپنی نابالغ بیٹیوں کو اپنی مقررہ قیمتوں پر فروخت کیا۔ کسی بھی قانونی نظام کی نگاہ میں اس زمانے میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

پیغمبر اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق اور رعایتیں عطا کیں جو مرور زمانہ کے ساتھ دیگر نظامہائے قانون نے رضاکارانہ طور پر اختیار کئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدد ازدواج کے رشتوں پر بعض شرائط اور پابندیاں عائد کیں۔ قانونی اختیارات اور فرائض کے حوالے سے دونوں صنفوں کے درمیان مکمل مساوات پر اصرار کیا، نہ صرف جسمانی ضروریات اور گھریلو آرام کی تکمیل بلکہ ادب و احترام محبت و انسیت کے اعتبار سے بھی عدل کی شرط لگاکر تعدد ازدواج کے امکانات کو محدود کردیا۔ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی کمتر حیثیت کو ایک نیا زاویہ دیا اور اسی مناسبت سے یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

"اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ان کے سوا) جو عورت تم کو پسند ہیں دو دو، یا تین تین، یا چار چار ان سے نکاح کرلو۔ پس اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے"۔ (النساء۔ ۳)

دشواری یہ پیش آئی کہ جلد ہی فقہاء اسلام کی نظر عدل کے مفہوم سے ہٹ گئی اور یہ حقیقت انہوں نے فراموش کردی کہ قرآن کے بیان کردہ جواز پابندی بلکہ بعض حالات میں ممانعت کے مترادف ہے۔ رد المختار میں مذکور ہے کہ "ہمارے بعض حکماء (مثلا معتزلہ) کا خیال ہے کہ عدل میں محبت و التفات شامل ہیں لیکن ہمارے اصحاب رائے اس خیال سے اختلاف رکھتے ہوئے اسے نفقہ کے معاملے میں مساوی برتاؤ سے تعبیر کرتے ہیں اور نفقے میں جو چیزیں شامل ہیں وہ کھانا، کپڑا اور رہائش۔ معتزلہ نے قرآنی قانون وضع کرتے ہوئے عدل کے اصول پر یک زوجگی کا ضابطہ نافذ کیا تھا جو اس وقت کے فرمانروا المامون کی تعصب پسندی کی بناء پر عام تصور کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کہ یک زوجگی صحیح معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

اسلام میں تعدد ازدواج کی عملی حقیقت عوامی تصور سے یکسر مختلف ہے اور اسلام تعدد ازدواج کی اجازت نہیں بلکہ سخت شرائط کے ساتھ صرف رخصت کے حق میں ہے۔

تعلیمات سے ہم آہنگ اور اس قرآنی احکام کے عین مطابق ہے کہ تم کئی عورتوں کے درمیان عدل پر قائم نہیں رہ سکتے چاہے اس کی کتنی ہی شدید خواہش تمہیں ہو، جدید قانونی نظام پر عمل پیرا بعض ممالک نے بالواسطہ یک زوجگی کا ضابطہ وضع کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو آئینی دفعات، دو زوجگی مخالف شرائط اور عدالتی یا سماجی اختیارات کے ذریعے تعدد ازدواج کو محدود کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایسے بھی ممالک ہیں جہاں تعدد ازدواج کو قطعا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تجربے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی عملی حقیقت عوامی تصور سے یکسر مختلف ہے اور اسلام تعدد ازدواج کی اجازت نہیں بلکہ سخت شرائط کے ساتھ صرف رخصت کے حق میں ہے۔ □

زندہ مسائل پر ملی ٹائمز کا ایک اور خصوصی شمارہ

ان کہی داستانوں اور سچی آپ بیتیوں پر مشتمل

پہلی بار

خلیج میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر ایک اہم دستاویز

خلیج اور ہندوستانی مسلمان

خلیج میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں؟ عرب اسلامی ثقافت کے عین قلب میں وہ خود کو کیسا محسوس کرتے ہیں؟ عربوں کے بارے میں ان کے تاثرات کیا ہیں؟ عرب دنیا میں انہیں کیا بھلا لگتا ہے اور کیا انہیں ناپسند ہے؟ خلیج کے قیام میں انہیں کیا ملا اور وہ کس چیز سے محروم ہوگئے؟ خلیج ایک محرک عامل کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں کیا رول ادا کر رہا ہے؟ اور وہ تمام ان کہی کہانیاں جو ہندوستانی مسلمان کسی وجہ سے عرب دوستوں سے نہیں کہہ سکتے ان تمام دلچسپ آپ بیتیوں پر مشتمل

ملی ٹائمز

ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ اگر آپ بھی خلیج ہو آئے ہیں تو اپنی آپ بیتی ہمیں لکھ بھیجیں۔ ہم اس شمارے میں اسے شامل کرلیں گے مزید تفصیلات کا انتظار کیجیے۔

The Milli Times International

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 25

Tel : 91 - 11 - 6827018 Fax : 91 - 11 - 6946686

Printed at Tej Press, Delhi. Ph.: 3317911

Price Rs. 5/-
November 1997
Vol : 4 Issue No : 7

The Milli Times International
D-149, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone : 6827018 Fax: (011) 6946686

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-11234/96

یہ ہاتھ ابھی کم ہیں

شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب ڈاکٹر سید ہاشم مہدی کے دفتر میں دعاؤں کا یہ منظر دیکھنے کو نہ ملتا ہو۔ صاف ستھرے جدید طرز کے اس دفتر میں جو بظاہر ایک عام سا تجارتی دفتر لگتا ہے نہ جانے کیا کشش ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں سے لوگ جوق در جوق حق کی تلاش میں آتے رہتے ہیں۔ آنے والوں میں ہر رنگ و نسل کے لوگ شامل ہیں۔ کوئی مشرق سے آیا ہے تو کوئی مغرب سے، کوئی جاپان اور سنگاپور سے کھینچا آتا ہے تو کوئی افریقہ کے دور دراز ملکوں سے۔ پریشان حال، مضطرب چہرے، شکستہ دل اور مایوس لوگ نہ جانے یہاں آکر کیا پاتے ہیں کہ جاتے وقت ان کے چہروں پر مسرت اور اطمینان لوٹ رہا ہوتا ہے۔



کوئی ربع صدی کا عرصہ گزرا سید ہاشم اپنے خوبصورت دفتر میں آخرت کی تجارت کر رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو ان کے ہاتھوں قبول اسلام کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ سید کا وجود ایک ایسے مشک کی مانند ہے جو مسلسل اپنی خوشبو پھینکتا رہتا ہے۔ سید ہاشم نہ تو کسی مدرسے کے فارغ التحصیل مولوی ہیں اور نہ ہی انہوں نے چلا کشی کے دوران کہیں تبلیغ کی تربیت پائی ہے۔ ان کی تربیت امریکہ اور یورپ کے اعلی دانشگاہوں میں ہوئی اور اپنی زندگی کا ایک قابل ذکر حصہ انہوں نے یورپ کے ظلمت کدہ کو اسلام کی روشنی سے منور کرنے میں صرف کیا۔ نہ جانے سید کے اندرون میں وہ کون سا درد ہے جو اسے ہر لمحہ اسلام کی سربلندی اور اس کی اشاعت کے لئے بے چین کئے رکھتا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خانوادے سے تعلق ہونے کا احساس انہیں ہر لمحہ مضطرب کئے دیتا ہے۔ وہ اپنے نانا کے دین کو مغلوب دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ خاموش تاریک راتوں میں جب دنیا سکون کی نیند سوتی ہے سید کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ بے اختیار خدا کی بارگاہ میں اٹھ جاتے ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں غلبہ اسلام کی مہم میں شرکت کے بعد سید ہاشم ان دنوں اپنے آبائی شہر مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں۔ کعبہ کے طواف میں جنون کا انداز لئے خشیت الٰہی سے سرشار اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھیگا بھیگا ہو بچوں سے دور کوئی عام سا آدمی دکھائی دے تو بہت ممکن ہے کہ ہو نہ ہو یہ شخص کوئی اور نہیں سید ہاشم مہدی ہی ہو۔

ہاشم کہتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت کے لئے نہ تو کسی خاص طریقہ تبلیغ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کتابوں کی اشاعت، لٹریچر کی تیاری یا اجتماعات اور گشت کو تبلیغ کا مؤثر نسخہ سمجھنا چاہیے۔ نہ جانے کب کس کا دل اسلام کی حقیقت کے لئے کھل جائے۔ ضروری نہیں کہ سائل کے سامنے کوئی ٹھوس علمی دلیل یا سائنسی ثبوت ہی پیش کیا جائے۔ جن دنوں وہ لندن میں اپنی فلیٹ میں مقیم تھے ان کے یہاں ایک انگریز مہمان ہوا۔ اسے سید کی روحانی شخصیت سے کچھ واقفیت تھی اور نہ ہی اسے کبھی اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ ایک صبح انگریزی طرز کے باتھ روم میں پانی سے بھرا لوٹا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی، اسے خیال آیا شاید مسلمان رفع حاجت کے بعد صرف کاغذ پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پانی سے طہارت لینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج پانی کا یہ تجربہ کیا جائے۔ دوسرے دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ پانی سے طہارت کے بعد اسے ایسا لگا جیسے وہ خود اپنے اندرون میں کچھ بہتر سا محسوس کرتا ہو۔ اس نے بہت سوچا آخر وہ کون سی چیز ہے جو اس کے اندرون میں ایک دھیمے دھیمے سکون کا احساس پیدا کرتی ہے۔ بہت غور کیا لیکن اپنے اس احساس کی توجیح میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے بار بار خیال آیا کہ جس مذہب کا طریقہ آب دست اسے روحانی سکون کے احساس سے آشنا کر سکتا ہے اس کی مکمل تعلیمات سے آشنائی اسے کیا کچھ نہ دے گی اور ایک صبح ناشتے کی میز پر اس نے بالآخر اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کی خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ اس سے جب یہ کہا گیا کہ وہ پہلے اسلام کی مکمل تعلیمات کو خوب اچھی طرح سمجھ لے تو کہنے لگا کہ مجھے اپنے اس تجربے کے بعد کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہ گئی ہے۔

کیا پتہ کب کون سی بات کس کا دل کھول دے۔ شرط یہ ہے کہ خود آپ کو اپنے اسلامی ورثے پر بلا کا اعتماد ہو اور آپ ہر لمحے اللہ کی بارگاہ میں اس کے دین کی خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ توفیق کے طالب ہوں اور سید ہاشم مہدی ہی کی طرح آپ کی گاڑھی کمائی کا ایک بڑا حصہ اللہ کی راہ میں صرف ہوتا ہو۔

دنیا کے مختلف حصوں میں اگر اس وقت اسلام کی طرف آنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے تو اس کا سبب سید ہاشم جیسے چند نفوس ہیں۔ آج دنیا کے مختلف گوشوں میں قوت اسلامی کے احیاء کا جو امکان پیدا ہو چلا ہے وہ ان ہی چند مسلسل اٹھتے ہوئے ہاتھوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر چند مضطرب دل اور بارگاہ الٰہی میں اٹھتے ہوئے بے قرار ہاتھ دنیا کو احیاء اسلامی کی صورت حال سے دوچار کر سکتے ہیں تو بہت سے عاجز ہاتھوں کا اٹھنا کیا کچھ نہ کر پائے گا۔ افسوس کہ یہ مقدس ہاتھ ابھی بہت تھوڑے ہیں۔ ▭